ہست و بُود

غلام حسین ساجد

ہست و بود

(شعری مجموعہ)

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نگرانِ اشاعت
شاعر علی شاعرؔ
0336-2085325

کتاب	:	ہست و بُود (شعری مجموعہ)
شاعر	:	غلام حسین ساجدؔ 0300-4423457
اشاعت	:	اکتوبر/2018ء
ناشر	:	رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی 0345-2610434 021-32761100 rangeadab@yahoo.com www.facebook.com/rangeadab
تزئین کار	:	شیرازی شاعر 0300-2054154
پرنٹر	:	محبوب پریس، کراچی
تعداد	:	500
صفحات	:	160
قیمت	:	=/500روپے

انتساب

اپنے پوتے

محمد عیسیٰ شہیر

کے نام

غزلیں

۲۰۰۴ء تا ۲۰۱۰ء

مزامیر

غزلیں

◆◆◆

دیباچہ

ہست و بُود

ڈاکٹر ناصر عبّاس نیّر

یہ حقیقت ہے کہ اُردو غزل سے بڑھ کر کلیشے کا شکار کوئی صنفِ ادب نہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کلیشے کے تخلیق دشمن ہونے سے آگاہ جس قدر غزل ہے کوئی دوسری صنف نہیں۔ گویا اُردو غزل دشمن اور اس کی تباہ کن طاقت کو پہچانتی بھی ہے اور اس کا شکار بھی ہو جاتی ہے۔ غزل میں غیر شناسی کا ملکہ غیر معمولی مگر غیر کے حملے سے بچنے کی صلاحیت غیر معمولی نہیں۔ یہ کلیشے لفظیات سے لے کر موضوع و مضمون تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مبادا غلط فہمی پیدا ہو، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ یہاں روئے سخن، غزل کے ساتھ ساتھ غزل گوؤں کی طرف بھی ہے۔ کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ غزل کی دنیا میں چھوٹے اور معمولی شاعروں یعنی تُک بندوں کو آسانی سے داخلہ ہی نہیں، شہریت بھی مل جاتی ہے؟ اس کا سبب، غزل میں موجود کلیشوں کی کثرت ہے، جنھیں یہ معمولی شاعر بروئے کار لاتے ہیں۔ چوں کہ عام قارئین سے وجود میں آنے والے سماجی عرصے میں ان کلیشوں کو تائید و پسندیدگی حاصل ہوتی ہے اس لیے کلیشوں یعنی مقبول موضوعات پر شعر لکھنے والوں کو جلد شہرت بھی مل جاتی ہے۔ دوسری طرف جو چیز ایک اوسط درجے کے غزل گو کے لیے نعمت ہے وہ ایک حقیقی شاعر کے لیے زہر کا درجہ رکھتی ہے۔ تُک بند اگر طفیلیہ ہوتا ہے تو حقیقی شاعر وہ سب کچھ خلق کرتا ہے جسے تُک بند بروئے کار لاتے ہیں (کیسا انوکھا واقعہ ہے کہ کئی مقبول شاعروں کا رزق ایک حقیقی شاعر کا خون پسینہ ہوتا ہے)۔ دُکھ جھیلے بی فاختہ اور کوّے انڈے کھائیں۔

حقیقی شاعر ایک طرح کی دوشیزگی یعنی Virginhood کا قائل ہوتا ہے وہ مضمون و معنی، لفظ و طرز کی اصل و اساسی حالت (جسے چھوا نہ گیا ہو) تک رسائی کو آدرش بناتا ہے۔ نہ پوچھیے اس

لیے اسے کس قدر جھاڑ جھنکار ہٹانا پڑتا ہے یعنی لفظ و مضمون کی عام فہم ساختوں سے لے کر اشیا و مظاہر کے رائج و مقبول تصورات تک کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اندھے اثبات کے بجائے خرد مندانہ انکار کو اپنا عقیدہ بنانا پڑتا ہے۔ یہ سارا عمل حقیقتاً ماضی کی تہوں میں اُترنے اور ماضی کی ہیئتوں، تشکیلات، بُتوں سے اُلجھنے کا ہے۔ ایک حقیقی شاعر خواہ وہ کس قدر حال و مستقبل کو اہمیت دیتا ہو، اسے اگر اشیا و مظاہر، ذات و دنیا اور لفظ و مضمون کی اصلی و اساسی حالت کو مس کرنا ہے تو اسے ماضی کے غاروں میں سفر کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک حقیقی تخلیق کار کا یہ انوکھا دبدھا ہے کہ وہ آگے بڑھنے کے لیے اُلٹے پاؤں چلتا ہے اور یہیں اس کا امتحان بھی شروع ہوتا ہے۔ ماضی، خواہ کس قدر تلخ، پس ماندہ، خراب حال رہا ہو، ایک طلسماتی دنیا کے طور پر ظاہر ہوتا ہے کچھ تو محض دُوری کے سبب اور کچھ ہماری عمومی یادداشت کے طریقِ کار کے سبب جو صرف خوش گوار باتوں کو محفوظ رکھتی ہے اور کچھ فنا ہو چکی، راکھ ہوئی دنیا کو پل بھر کے لیے 'زندہ' دیکھنے کے سبب۔ اگر تخلیق کار اس طلسم کا شکار ہو جائے اور اس کے بتوں کی محبت میں مبتلا ہو جائے اور یہ بھول جائے کہ اسے اشیا و انفاس کی اصل و اساس کے سوال کا جواب تلاش کرنا ہے تو وہ پتھر ہو جاتا ہے (اُردو غزل گوؤں کی ایک پوری نسل ماضی کے طلسم میں گرفتار ہوئی۔ وہ پتھر میں تبدیل ہوئی یا نہیں، یہ ایک الگ بحث ہے)۔ ماضی کے طلسم کا سامنا، ہر تخلیق کار کی تقدیر ہے، مگر اس طلسم سے باہر آنے کی حکمت ہی میں کسی لکھنے والے کی نجات ہے۔ اب یہ کسی لکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ اپنی تقدیر پر راضی رہتا ہے یا اپنی اور دوسروں کی نجات کی سعی بھی کرتا ہے۔ نجات و آزادی کیا ہے؟ بت شکنی و زنجیر شکنی۔ دنیا میں کون سا ایسا بُت یا کون سی ایسی زنجیر ہے جسے کل نے ہمارے دل و دماغ میں ایک تقدیس یا آئیڈیالوجی کی شکل میں نہیں بسایا، ہمارے پُرکھوں کے توہمات و اساطیر نے ہمارے پاؤں میں نہیں ڈالا!

معاصر اُردو غزل میں طفیلی شعرا کے جمِ غفیر کا شور اس قدر ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، جب کہ غزل کے حقیقی شاعروں کی مُٹھی بھر تعداد ہے جن کی آواز اس شور میں دب تو نہیں گئی کہ اس کی ایجادیت اس کو ناقابلِ شکست بناتی ہے مگر اسے پہچاننے کے لیے خاموشی و سرگوشی کو سمجھنے کا ذوق اور فہم چاہیے۔

یہ تمہید غلام حسین ساجدؔ کے نئے شعری مجموعے "ہست و بود" کی خاموشی و سرگوشی کو سننے، سمجھنے اور جہاں تک ممکن ہو سراہنے کی خاطر باندھی گئی ہے۔ اس مصنف کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ غلام حسین ساجد لفظ و مضمون سے لے کر اشیا و مظاہر کی اصلی و اساسی حالت تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ وہ ماضی کے طلسم کا سامنا کرتے ہیں اس کا شکار نہیں ہوتے۔ ان کا ماضی شخصی کم اور ثقافتی زیادہ ہے۔ کہیں کہیں وہ اپنے بچپن، اپنے وطن (ملتان) کی طرف پلٹتے ہیں، مگر زیادہ تر وہ بصرہ و بغداد و قرطبہ کو یاد کرتے ہیں، اپنے شعروں میں ورثے کے سمندر کا ذکر بھی کرتے ہیں، کلاسیکی شعرا کی مانند فارسی تراکیب وضع کرتے ہیں (مثلاً شگفتِ نور، چراغِ کوئے نگاراں، زرِ جمالِ خواب، زرِ صبر، رِدائے راحتِ کون و مکاں، صباحتِ نام و نشاں وغیرہ) اور کئی پرانی تراکیب (جیسے رنگِ سخن، دمِ شمشیر، بازوئے قاتل، نقشِ پا، شہرِ آرزو، ماہِ نخشب، جنونِ عشق، دشتِ نجد وغیرہ) استعمال کرتے ہیں "مَیں ایک کھوئی ہوئی آگ کی تلاش میں تھا" جیسے مصرعے لکھتے ہیں لیکن دوسری طرف ان کا بنیادی شعری رویہ لفظ و مضمون کو اُلٹ پلٹ کر دیکھنے، رائج و مانوس تلازمات کو رد کرنے، عام فہم معنوی ساختوں کو تہ و بالا کرنے اور اس سب کے نتیجے میں ایک عالمِ حیرت تخلیق کرنے کا ہے۔

ساجدؔ صاحب کی شناخت عموماً ستّر کی دہائی کے شعرا کے ایک رکن کے طور پر کی جاتی رہی ہے۔ (چار دہائیاں گزرنے کے بعد تو ضروری ہے کہ اس دہائی کے تمام شعرا کے انفرادی مطالعات کیے جائیں اور ہر شاعر کی جداگانہ شناخت کو واضح کیا جائے)۔ تاہم اب ان کی ایک الگ شناخت ہے اور جدید اُردو غزل کی دو چار معتبر آوازوں میں سے ایک ہیں۔ ستّر کی دہائی کے شعرا کو اپنی الگ شناخت پر اصرار تھا۔ یہ شناخت کیا تھی؟ بہ قول محمد خالد "پرانی لفظیات کی جانچ پڑتال کے عمل میں نئی غزل کے پاؤں کلاسیکی غزل کی روایت میں پوری طرح جم گئے اور روایت کا نام گالی نہیں رہا۔" ستّر کی دہائی کے شعرا نے کلاسیکی شعریات کی طرف رجوع اس لیے بھی کیا کہ ان سے پہلی نسل شدّت پسندانہ جدیدیت کے زیرِ اثر تمام اساسی شعری ہیئتوں، جمالیاتی ساختوں کی توڑ پھوڑ کر رہی تھی اور ایک انتشار کا عالم برپا کیے ہوئے تھی۔ اس نسل نے غزل کی روایتی جمالیات کو گزند پہنچانے سے بھی گریز کیا اور اس جمالیات کا اسیر ہونے سے بھی۔ اس رائے کا

ایک حد تک اطلاق غلام حسین ساجد کی غزل پر بھی ہوتا ہے۔ یہ اصول اگر ایک طرف نسبتاً سہل تھا تو دوسری طرف ایک چیلنج سے کم نہیں تھا، معمولی صلاحیت کے شاعر کے لیے یہ سہل تھا کہ وہ روایت کی گود میں سر رکھ کے نئے جہاں کے خواب دیکھے۔ لیکن دنیا کو اپنی انفرادی نظر سے دیکھنے کی تمنا رکھنے والے حقیقی شاعر کے لیے یہی اُصول چیلنج تھا کہ وہ کیوں کر روایت کی جانی پہچانی سرزمین پر پاؤں جمائے ہوئے، اپنی نئی، اجنبی دنیا کی پہچان کا سفر بھی کر سکے۔ غلام حسین ساجد نے اس اُصول کو چیلنج ہی سمجھا۔ وہ کلاسیکی غزل کے لہجوں، لفظیات، مضامین کی جان پڑتال کرتے ہیں۔ مگر پہلے دیکھنے والی بات یہ ہے کہ جانچ پڑتال ہے کیا؟ ظاہر ہے، یہ تقلید و نقالی نہیں، روایت کا ایک تقدیس آمیز اثبات نہیں اور نہ ایک پُر جوش انکار ہے۔ ہمیں ساجد صاحب کے یہاں انکار کی نعرہ باز قسم کی بلند آہنگی ملتی ہے نہ ایک انتہائی منکسر المزاج قسم کی عقیدت مندی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ اعتدال کا محفوظ مگر پامال راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جسے اکثر اعتدال کہا جاتا ہے وہ انکار کی جرأت سے محرومی کی نفسیاتی ڈھال ہوتا ہے۔ اگر ہم ساجد صاحب کے شعری روّیے کو اعتدال کا نام دیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ ان کے یہاں جو کچھ ہے وہ کہیں کلاسیکیت ہے اور کہیں جدیدیت ہے، وہ کبھی اِدھر ہوتے ہیں اور کبھی اُدھر یا پھر وہ پورے کلاسیکی ہونے اور مکمل طور پر جدید ہونے سے خوف زدہ ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اُنہوں نے کلاسیکی غزل کی لفظیات و مضامین کی چھان پھٹک اس لیے کی ہے کہ وہ ان تمام آوازوں کو اچھی طرح جان سکیں جن سے انہیں ایک مختلف آواز، ایک منفرد لہجہ، ایک نیا اندازِ تکلم خلق کرنا ہے۔ وہ پہلے سے موجود کسی محفوظ راستے پر چلنے کے بجائے، ایک نیا اور نسبتاً پُر خطر راستہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کی غزل کی شناخت کا پہلا اہم زاویہ ایک نیا اندازِ تکلّم ہے۔ جہاں تکلّم ہوتا ہے، وہاں کوئی متکلّم بھی ہوتا ہے اور متکلّم لازماً کسی مقام سے، کسی تناظر سے کلام کرتا ہے۔ یہ اشعار دیکھیے اور ان کے مضامین کے ساتھ ساتھ ان کے متکلّم اور تناظر پر غور کیجیے:

بھٹک کے آئی تھی کچھ دیر کو اِدھر دنیا
لپٹ گئی مرے دل سے کسی بَلا کی طرح

☆

اِک روز مَیں بھی بابِ سخن سے گزر کروں
یعنی کتابِ دشت و چمن سے گزر کروں

☆

شگفتِ آب سے مٹی کو آئنہ کرتے
چراغ سرد نہ ہوتے تو زمزمہ کرتے

☆

چراغ و آئنہ و خواب پر نہیں موقوف
مَیں بھول سکتا ہوں اس حال میں کہیں کچھ بھی

☆

نگار خانۂ گردوں کو راکھ کرتے ہُوئے
ذرا سی دیر کسی طاقچے میں جل کر دیکھ

☆

کسی وجود میں جلتا ہُوا چراغ ہُوں مَیں
سو اس نگر کے اندھیرے پر ایک داغ ہُوں مَیں

پہلے شعر کے متکلم، اس کے لہجے اور کلام کے تناظر پر غور کیجیے۔ متکلم دنیا اور دل کے تعلق سے ایک مضمون باندھ رہا ہے۔ سرسری نظر میں یہ مضمون دنیا کو نندنے کا ہے۔ دنیا کو نندنا ہی ہماری شعری روایت میں عام ہے۔ یہ مضمون تصوّف کی راہ سے آیا ہے۔ ذوقؔ کا شعر ہے:

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

اِسی طرح اکبرؔ کا مشہور شعر ہے:

دنیا میں ہُوں، دنیا کا طلب گار نہیں ہُوں
بازار سے گزرا ہوں، خریدار نہیں ہُوں

دل اور دنیا کا تعلق جدید شعرا کے یہاں بھی ملتا ہے۔ افتخار عارف کا شعر ہے:

راس آنے لگی دنیا تو کہا دل نے کہ جا
اب تجھے درد کی دولت نہیں ملنے والی

گویا ہماری شعری روایت میں دل اور دنیا کی جدلیات ہے، دنیا دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے دل کبھی مزاحمت کرتا ہے اور کبھی ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ جب دنیا کے مقابلے میں دل ہارتا ہے تو اپنی متاعِ عزیز سے یعنی درد کی دولت سے ہاتھ دھوتا ہے۔ یہ مضمون کم وبیش سٹیریو ٹائپ اور اُردو غزل کا ایک کلیشے ہے اس مفہوم میں کہ دل و دنیا کی کہانی کے واقعات یکساں ہیں اور ہر واقعے کے بارے میں پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔ لیکن غلام حسین ساجد کے یہاں یہ صورت نہیں ہے۔ شعر کا مضمون روایت سے ماخوذ ہے مگر شاعر نے اسے اُلٹ پلٹ کر کچھ ایسا بنا دیا ہے کہ اس میں کچھ خلا، کچھ خاموشیاں پیدا ہو گئی ہیں اور ان کی وجہ سے شعر میں معانی کی پھوار کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اس سارے عمل میں بنیادی کردار شعر کے اندازِ تکلّم اور متکلّم کا ہے۔ متکلّم کو ہم اس کے مقامِ تکلّم اور اس کے لہجے سے پہچان سکتے ہیں۔ مقامِ تکلّم کی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ٹھیک ٹھیک نشان زدہ نہیں کیا جاسکتا اس لیے کہ یہ کوئی مکانی نکتہ نہیں ہے، ہم بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک ایسے مقام سے کلام کر رہا ہے جو دنیا و دل کی کہانی کے گزر چکنے، قصۂ پارینہ ہو چکنے کا مقام ہے۔ یہ کسی دورِ ماضی کا قصہ ہے اور اسے جس لہجے میں بیان کیا گیا ہے وہ نیم بے نیازی کا ہے۔ اب ذرا شعر کی خالی جگہوں، خاموشیوں پر غور کیجیے اور ان میں چھپے معانی کے جلوے دیکھیے دنیا کس طرف کچھ دیر کو بھٹک کے آئی تھی؟ دل کی طرف یا کائنات کی طرف یا اس مقام کی طرف جہاں سے شعر کا متکلّم کلام کر رہا ہے؟ پھر دنیا کے بھٹکنے کا کیا معنی؟ بھٹکتا تو دل ہے۔ جب دنیا دل کو راس آنے لگتی ہے تو اسے دل کا بھٹکنا کہتے ہیں۔ دنیا کیسے بھٹک گئی؟ کیا دنیا ایک سیّارے کی طرح ہے جو اپنے مدار سے باہر کہیں آ گیا اور راستہ بھٹک گیا یا خود دنیا کا بھی ایک دل ہے جو اسے بھٹکا سکتا ہے؟ اسی طرح دنیا اگر دل سے بلا کی طرح لپٹ گئی تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ دنیا دراصل دل کی تلاش میں بھٹک رہی تھی۔ اگر ایسا ہے تو دل معصوم ہے ساری خرابی دنیا میں ہے۔

دوسرے شعر کا عالم ذرا مختلف ہے۔ سب سے پہلے شعر کی رعایتوں پر غور کیجیے۔ باب، کتاب، سخن، دشت، چمن۔ بلاشبہ رعایتوں کا تصوّر کلاسیکی غزل ہی سے آیا ہے مگر شاعر نے

رعایتوں کے کلاسیکی نظام کی نقل کی بجائے، رعایت کے تصوّر سے استفادہ کیا ہے۔ کلاسیکی غزل میں رعایتیں واضح اور متعین ہوتی ہیں جب کہ ساجد صاحب نے زیادہ تر بین السطور رعایتوں کا اہتمام کیا ہے۔ اگر چہ لفظیات کلاسیکی غزل کی ہیں۔ بابِ سخن کی ترکیب اوّل اوّل ہمیں ولی کے یہاں ملتی ہے:

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں
تا قیامت کُھلا ہے بابِ سخن

کیا اس شعر کا متکلم خود شاعر ہے جو بابِ سخن سے گزرنے کی تمنا کر رہا ہے؟ اگر ایسا ہے تو سخن لکھنے اور بابِ سخن سے گزرنے میں کیا فرق ہے؟ یعنی خالق خود کو مخلوق کے تناظر میں دیکھنے کا ارادہ کر رہا ہے؟ دوسری طرف اگر شعر کا مَیں شاعر نہیں، ایک عام انسان کا نمائندہ ہے تو شعر کے معانی بدل جائیں گے۔ بابِ سخن یعنی کتابِ دشت و چمن، دنیا کے مقابل ایک دنیا ہے۔ اس صورت میں شعر، کتاب کی دنیا اور حقیقی دنیا کی جدلیات کو پیش کرتا ہے۔ کتاب کی دنیا کے اپنے دشت و چمن ہیں جو باہر کی دنیا کا عکس نہیں۔ اگر یہ عکس ہوتے تو اسی دنیا کو دوبارہ دیکھنے کی کیا منطق ہے؟ شعر کا منشا یہ نظر آتا ہے کہ باہر کی دنیا بہت دیکھ لی اب ذرا اس دنیا کو بھی دیکھ لیں جو ایک اور طرح کی دنیا ہے خواب کے مانند۔ دنیا اگر شب ہے تو کتاب ایک چراغ ہے۔ ساجد صاحب شاعری کو دنیا کا عکس نہیں سمجھتے، چراغ کہتے ہیں۔ مثلاً پانچویں شعر میں وہ نگار خانۂ گردوں کو راکھ کرنے اور طاقچے میں چراغ کی طرح جلنے کی بات کرتے ہیں۔ یعنی نگار خانۂ گردوں کی روشنی بجھا کر اپنی تخلیق کے چراغ کو روشن کرنے کا ذکر کرتے ہیں۔ کیسی انوکھی بات ہے کہ چراغ، آئنہ اور خواب، غلام حسین ساجد کی محبوب لفظیات ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار جنہیں بے قصد جہاں تہاں سے چنا گیا ہے ان کے آخری چاروں شعروں میں چراغ کا استعارہ استعمال ہوا ہے۔ لیکن چراغ پر بات کرنے سے پہلے یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ دوسرے شعر کے معانی کا تعدد در حقیقت متکلم یعنی مَیں کے کلام کے محل و مقام کے غیر متعین ہونے کا پیدا کردہ ہے اور اس بات کی غیر معمولی اہمیت ہے۔ اگر شاعری میں متکلم اور تکلم کے محل و مقام کو حتمی طور پر متعین یعنی Locate کیا جا سکے تو شاعری خطابت میں بدل جاتی ہے۔

غلام حسین ساجد غزل میں ایک اپنا استعاراتی نظام تو رکھتے ہیں مگر اپنے شعری تخیل کو اس نظام کی بھینٹ نہیں چڑھاتے۔ مخصوص لفظیات کا کردار دوہرا ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ کسی تخلیق کار کی پہچان بنتے ہیں تو دوسری طرف اسی تخلیق کار کے لیے زنداں بھی بننے کا امکان رکھتے ہیں۔ استعاراتی نظام اپنی بدترین صورت میں چند محدود لفظوں اور مخصوص خیالوں کی ناگوار تکرار یعنی کلیشے میں بدل جاتا ہے جب کہ اپنی بہترین صورت میں ایک قسم کا مابعد الطبیعیاتی منطقہ وجود میں لاتا ہے۔ ایک حقیقی تخلیق کار کے لیے کلیشے اور مابعد الطبیعیاتی منطقہ دونوں زنداں ہیں بس فرق یہ ہے کہ ایک نچلے درجے کا زنداں ہے اور دوسرا اعلیٰ درجے کا۔ ہر مابعد الطبیعیات معانی کا مجرد نظام ہے جس کی مطابقت مادّی حسّی حقیقت سے ہونا ضروری نہیں بلکہ مابعد الطبیعیات قائم ہی اس وقت ہوتی ہے جب وہ مادّی حسّی حقیقت سے خود کو آزاد رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہو۔ جب کوئی شاعر اپنی خاص لفظیات کی تکرار سے ایک اپنی مابعد الطبیعیات وضع کر لیتا ہے تو اس میں وہ قید ہو کر رہ جاتا ہے وہ ہر نئی بات ہر آنے والے لمحے، ہر نئے واقعے کی تعبیر اپنی ہی تشکیل کردہ مابعد الطبیعیات کی مدد سے کرنے لگتا ہے۔ اس طور وہ کوئی نئی بات نہیں کہتا، فقط اپنے شعری تخیل پر اپنی مابعد الطبیعیات کے اجارے کی توثیق کرتا ہے۔ نیز اس کی فکر مادّی و حسّی حقیقت کے سلسلے میں لاتعلق ہو جاتی ہے۔ ایک حقیقی تخلیق کار کے سامنے یہ سوال مسلسل رہتا ہے کہ وہ کس طرح ایک طرف اپنی شناخت، اپنے خاص استعاراتی نظام کی مدد سے قائم کرے اور دوسری طرف خود اس کے زنداں میں قید ہونے سے محفوظ بھی رہے۔ یہ تنے ہوئے رسّے پر چلنے کی طرح ہے۔ نظر کی ذرا سی چوک سے اس کی شاعری کا انجر پنجر ڈھیلا ہو سکتا ہے۔ دیکھنے والی بات یہ ہے کہ غلام حسین ساجد کے یہاں استعاراتی نظام کی کون سی صورت ملتی ہے؟ کلیشے کی یا مابعد الطبیعیاتی منطقے کی؟ کلیشے کی صورت تو بالکل نہیں، البتہ ایک طرح کا مابعد الطبیعیاتی منطقہ ضرور وجود میں آتا محسوس ہوتا ہے۔ ''ہست و بود'' میں شامل غزلیات میں وہ اپنی مخصوص لفظیات کو وقفوں سے دہراتے ہیں۔ ہر چوتھی پانچویں غزل میں خواب، آئنہ، چراغ، مٹی، دشت، صحن، چمن، یقین، گماں، دریا، صحرا کے استعارے لاتے ہیں۔ ظاہر ہے محض ان لفظیات کی وجہ سے غلام حسین ساجد کی ایک الگ شناخت قائم نہیں ہوتی اس لیے کہ یہ سب ہمیں کلاسیکی اور جدید غزل میں ملتی ہیں۔ حقیقت یہ بھی ہے کہ کسی

غزل گو کو ان سے مفر نہیں۔ غزل جس ثقافتی کائنات سے اپنے اظہار کے قرینے اخذ کرتی ہے وہ فطرت کے بڑے بڑے مظاہر اور آدمی کی داخلی دنیا کی اجتماعی علامتوں سے عبارت ہے۔ نظم کے برعکس غزل شاعر کی نجی ذات کا اظہار یہ شاید ہی بن پاتی ہو، غلام حسین ساجد اپنی مخصوص لفظیات کو کلیشے کا شکار ہونے سے بچانے کے لیے انہیں خاص استعاراتی مفاہیم سے وابستہ کرتے ہیں۔ نیز انہیں نئے نئے تلازمات اور نئے سیاق میں استعمال کرتے ہیں انہیں مسلسل اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں کہیں کہیں ان لفظیات کے معمول کے معانی کو بھی سامنے لاتے ہیں مگر اکثر انہیں نسبتاً نامانوس نئے معانی کی تخلیق کا ذریعہ بناتے ہیں۔

گزشتہ صفحات میں درج کیے گئے اشعار میں سے آخری شعر میں چراغ کا استعارہ استعمال ہوا ہے۔ شعر کا لہجہ طنز آمیز یعنی Ironic ہے۔ متکلم خود کو چراغ قرار دے رہا ہے مگر جس اندھیرے (اور اندھے) نگر میں وہ موجود ہے اسے چراغ کی حاجت ہی نہیں (یہ پہلو بین السطور بیان ہوا ہے) اس لیے وہ طنزاً کہتا ہے کہ اس کی حیثیت ایک داغ کی سی ہے۔ اُردو غزل میں چراغ اور داغ کا باہم ذکر کوئی نئی بات نہیں۔ ایک مشہور شعر ہے:

دل کے پھپھولے جل اُٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اسی طرح خود کو چراغ قرار دینے کا مضمون بھی پہلے سے موجود ہے۔ مثلاً ظہیر کاشمیری کا مشہور شعر ہے:

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخرِ شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے

ظہیر کاشمیری کا شعر کا لہجہ مخصوص ترقی پسندانہ رجائیت کا حامل ہے جب کہ ساجد صاحب کے یہاں ہمیں اس کے برعکس طنز (واضح رہے کہ Satire یہ نہیں Irony ہے) ملتا ہے۔ آئرنی کی خوبی یہ ہے کہ اس میں توقع کو شکست دینے کی شعری تدبیر ہوتی ہے۔ مذکورہ شعر کے پہلے مصرع میں چراغ سے جو توقع پیدا ہوتی ہے دوسرا مصرع اس کی شکست کرتا ہے جلتا ہوا چراغ اندھیرا مٹانے کی بجائے اندھیرے پر ایک دھبا بن جاتا ہے۔ اگر ہم لہجے کو محض متن کے معانی بیان

کرنے کا طور سمجھنے کے علاوہ معنی ہی سمجھیں تو ہم شعر کی بہتر تفہیم کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں طنز آمیز لہجہ معنی خیز نہیں بجائے خود معنی ہے۔ متکلم خود کو جلتا ہوا چراغ کہہ رہا ہے۔ گویا اس امر پر اصرار کر رہا ہے کہ چراغ سرد بھی ہو سکتا ہے وہ ہر طرح کی مشکلات یعنی تیز ہواؤں کے باوجود جل رہا ہے اور کہیں باہر نہیں ایک وجود میں جل رہا ہے (اپنے وجود میں یا دوسرے وجود میں یہ بات اخفا میں ہے)۔ وجود میں جل رہا ہے تو وجود کو روشن بھی کر رہا ہے مگر یہ وجود جس اندھیرے نگر میں ہے وہاں چراغ کی حیثیت داغ کی ہے۔ اندھیرے پر داغ کیا نادر شاعرانہ تمثال ہے جسے اندھیرے کو روشن کرنا چاہیے تھا وہ اندھیرے کے لیے دھبّا سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ طنز اس جدید حسیّت اور وجودی فکر ہی میں قابلِ فہم ہے جو وجود و نگر یا فرد و سماج میں اجنبیت و بے گانگی دیکھتی ہے۔ جسے فرد روشنی سمجھتا ہے سماج اسے اپنے لیے دھبّا سمجھتا ہے سماج فرد کی بہترین کوششوں کا مضحکہ اُڑاتا ہے یا ان کوششوں کے مقاصد و مفاہیم کی تعبیر کو مسخ کر کے پیش کرتا ہے۔ سماج تو ایک تجرید ہے جس کا خیال فرد ہی کو آتا ہے اس لیے بے گانگی و اجنبیت کا سارا کرب فرد ہی جھیلتا ہے۔ لہٰذا سماج پر کیا جانے والا طنز واپس فرد ہی کی طرف پلٹ آتا ہے (جدید غزل میں یگانہ نے طنز سے سب سے زیادہ کام لیا)۔ ان معروضات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ شعر میں چراغ تخلیق، بیداری، خود آگاہی، بصیرت کا ایک استعارہ ہے یہاں تک اس استعارے میں کچھ زیادہ نیا پن نہیں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غلام حسین ساجد کے شعر میں یہ اشارہ موجود ہے کہ چراغ کا یہ استعاراتی مفہوم معرضِ خطر میں ہے اور اس امر کا طنز آمیز احساس بھی موجود ہے تو اس میں ایک نیا پن پیدا ہوتا ہے۔ اب دیکھیے دیگر اشعار میں ساجد صاحب چراغ کو کن مفاہیم میں استعمال کرتے ہیں:

اُتر رہی ہے سیاہی مری رگ و پے میں
کسی چراغ کا رہتا ہے انتظار مجھے

☆

مگن رہا وہ اندھیرے کے کھوج میں لیکن
کسی چراغ سے پھر رابطہ اُسی کا ہُوا

☆

سُرخ پتّوں میں دہکتے ہیں چراغ
سبز شاخوں پر سنہری بور ہے

☆

کبھی چراغ، کبھی آئنہ بناتے ہُوئے
اُسے نگاہ میں رکھتا ہُوں مسکراتے ہُوئے

☆

ذرا سا پھڑ پھڑاتی ہیں چراغوں کی لویں ساجدؔ
دمِ شمشیر سے جب بازوئے قاتل بناتا ہُوں

☆

کوئی چراغ اگر ہو مرے تعاقب میں
تھکن سمیٹتا جاؤں نقوشِ پا سے مَیں

☆

بُجھا سکتا نہیں ہے کوئی میرے آئنے کو
اندھیرے میں بھی یہ آبِ رواں روشن رہے گا

☆

مَیں اُس چراغ کی حدّت نہ سہ سکا ساجدؔ
فروغِ وصل سے مجھ ناتواں کا رنگ اُڑا

☆

متاعِ دوش رہے گی نہ باغِ آیندہ
لپٹ رہی ہے بساطِ چراغِ آیندہ

☆

شب بھر اُسی نواح میں پھیلے گی روشنی
ہو گی مرے چراغ سے ترسیلِ ہست و بود

یہ اشعار ''ہست و بود'' میں سے بغیر کسی ترتیب کے لیے گئے ہیں۔ان اشعار میں اگر کوئی ایک بات مشترک ہے تو یہ ہے کہ ہر شعر میں چراغ کا معنی شعر کے داخلی سیاق کا پابند ہے۔شاعر نے چراغ کے عام فہم مفہوم کو اشعار میں نہیں دہرایا۔غلام حسین ساجد کی غزل اس بصیرت سے سرفراز محسوس ہوتی ہے کہ چراغ کا عام فہم مفہوم باہر کا مفہوم ہے جو شعر کی تخلیق سے پہلے وجود رکھتا ہے۔شاعر اس 'باہر' اور پہلے وجود رکھنے والے مفہوم کی مدد سے باہر کی دنیا سے تعلق قائم کرتا ہے لیکن اگر وہ اسی مفہوم کو دہراتا ہے تو اس کی شاعری باہر کی دنیا کا ایک بھونڈا عکس بن کر رہ جاتی ہے۔چناں چہ غلام حسین ساجد کو اس کے عام فہم مفہوم کو منہدم نہیں کرتے مگر اسے معرضِ تعطل میں ضرور رکھتے ہیں۔اس کے لیے وہ چراغ کو نئے نئے سیاق میں استعمال کرتے ہیں۔

اوپر درج کیے گئے اشعار میں سے پہلا شعر سادہ ہے۔اس میں چراغ اور سیاہی کی روایتی جدلیات کا بیان ہوا ہے۔البتہ (خون کی جگہ) سیاہی کا رگ و پے میں اُترنا ایک نئی بات ضرور ہے۔البتہ دوسرا شعر غیر معمولی ہے۔اس میں بہ ظاہر تو چراغ اپنے روایتی اور بڑی حد تک لغوی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس میں اندھیرے اور چراغ کی وہی مانوس جدلیات کارفرما ہوتی ہے لیکن جب ہم چراغ کے مفہوم کا تعین شعر کے داخلی سیاق میں کرتے ہیں تو کچھ نئی باتیں روشن ہوتی ہیں۔شعر چراغ کے ظاہری معنی کو خود اپنے قرینے سے شکست دیتا ہے۔'وہ' کون تھا جو اندھیرے کی تلاش میں تھا؟ 'ہم' عموماً روشنی یا چراغ کو ڈھونڈتے ہیں پھر وہ کون ہے جو ہمارے عمومی مقاصد کے برخلاف چلتا ہے؟ کلاسیکی اُردو غزل میں 'وہ' کی ضمیر غائب محبوب کے لیے استعمال ہوتی ہے:

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

غالبؔ

وہ نہیں بھولتا جہاں جاؤں
ہائے مَیں کیا کروں، کہاں جاؤں

ناسخؔ

تو کیا شاعر نے محبوب پر طنز کیا ہے کہ اسے اندھیرے کی تلاش تھی یعنی رقیبِ روسیاہ کی اور اچانک اس کا رابطہ سچے عاشق یعنی چراغ سے ہوگیا؟ محبوب کے رقیب کی طرف اِلتفات کو بھی کلاسیکی شاعروں نے کثرت سے موضوع بنایا ہے۔ شعر کے معنی کی یہ ساخت قطعاً روایتی ہے، جسے نسبتاً نئے استعاروں میں پیش کیا گیا ہے۔ اگر ہم ساجد صاحب کی شاعری میں سے جھلکنے والے روایتی معانی ہی کے انکشاف تک محدود رہیں تو ان کی شاعری سے سخت ناانصافی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکی غزل کو ہم ان کی غزل کے پس منظر میں رکھ سکتے ہیں متوازی نہیں۔ چناں چہ شعر کا یہ معنی بھی پس منظری معنی ہے (اور اسی بنا پر مانوس معنی ہے) لیکن ایک دوسرا معنی بھی شعر میں لَو دے رہا ہے اور جب دوسرا معنی روشن ہوتا ہے تو پہلا معنی تعطل و التوا میں چلا جاتا ہے۔ (دوسرے لفظوں میں وہ ماضی کے طلسم کا سامنا کرتے ہیں مگر اس سے بچ نکلتے ہیں)۔ یہ دوسرا معنی نیم اساطیری، نیم روحانی جہت رکھتا ہے۔ قدیم اساطیر میں ہیرو کو تاریک غاروں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اُردو داستانوں میں بھی ہمیں ہیرو کنویں، غار وغیرہ میں بھٹکتا دِکھائی دیتا ہے (مثلاً حاتم طائی دوسرے سوال "نیکی کر دریا میں ڈال" کے جواب کی تلاش میں ایک انتہائی تاریک پُراسرار غار کو پار کرتا ہے)۔ غار کے ایک سرے پر خوف، تاریکی اور اسرار ہیں، غار کے سفر کے دوران میں جن میں مسلسل اضافہ ہوتا ہے مگر دوسرے سرے پر روشنی ہے۔ روشنی تک رسائی، تاریکی کا سینہ چیرے بغیر ممکن نہیں۔ یہی بات اس شعر میں کہی گئی ہے۔ تاہم واضح رہے کہ غار کے دوسرے سرے پر جو روشنی ہے اس کا ماخذ مسافر کی جستجو اور غیر متزلزل ارادہ ہے۔ گویا یہ روشنی دریافت نہیں کی جاتی، خلق کی جاتی ہے۔ اسی سے ملتی جلتی بات ساجد صاحب نے اس شعر میں کہی ہے:

کبھی چراغ، کبھی آئنہ بناتے ہُوئے
اُسے نگاہ میں رکھتا ہُوں مسکراتے ہُوئے

لطف کی بات یہ ہے کہ اس شعر کا پس منظری معنی بھی روایتی اُردو غزل کے مضمون سے ماخوذ ہے۔ یہ کہ شاعری (یعنی چراغ و آئنہ) تبسم و جمالِ یار کا عکس ہے یا اس سے تحریک پاتی ہے یا شاعری کا سارا حسن و نور، جلوۂ محبوب کی عطا ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہاں بھی دیگر معنی موجود ہیں۔ مثلاً لفظ کبھی پر غور کیجیے اور شعر کی دوبارہ قرأت کیجیے۔ میں ہمیشہ نہیں، کبھی چراغ اور کبھی آئنہ بناتے

ہوئے اس کی مسکراہٹ کو نگاہ میں رکھتا ہوں۔ (یہاں ایک نہایت نازک رعایت شعر میں موجود ہے۔ چراغ کی لو، آئنے کی چمک اور مسکراہٹ کی دمک)۔ گویا اس کی مسکراہٹ ہمیشہ میری نگاہ میں نہیں ہوتی۔ نیز شعر کا متکلم کہتا ہے کہ میں کبھی تو چراغ بناتا ہوں میں ایک نہیں دو کام کرتا ہوں۔ چراغ روشن ہوتا ہے اور آئنہ روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ چراغ اس سب کو نور کے دائرے میں لاتا ہے جو تاریکی میں ملفوف ہوتا ہے جب کہ آئنہ صرف اسی کو مکرر پیش کرتا ہے جو پہلے ہی سے نور کے دائرے میں ہوتا ہے۔ یوں چراغ ایک حقیقی وجود کی علامت ہے اور آئنہ کسی حقیقی وجود کی پرچھائیں کی۔ آئنے کے اس مفہوم سے متعلق کرشن بہاری نورؔ کا کیا عمدہ شعر ہے:

آئنہ یہ تو بتاتا ہے کہ مَیں کیا ہُوں مگر
آئنہ اس پہ ہے خاموش کہ کیا ہے مجھ میں

چراغ اور آئنہ آرکی ٹائپل سطح پر تخلیق اور نقل کے استعارے ہیں یعنی چراغ نئی اشیا کو خلق کرنے اور آئنہ موجود اشیا کی ٹھیک ٹھیک نمائندگی کرنے کا استعارہ ہے۔ تاہم کلاسیکی شاعری میں آئنہ دل کی علامت بھی ہے سیمابؔ اکبر آبادی کا کیا زبردست شعر ہے:

دل کی بساط کیا تھی نگاہِ جمال میں
اِک آئنہ تھا ٹوٹ گیا دیکھ بھال میں

غلام حسین ساجد کے یہاں چراغ اور آئنے کے یہ دونوں آرکی ٹائپل مفاہیم موجود ہیں اور دل چسپ بات یہ ہے کہ ایک سے زیادہ سطحوں پر موجود ہیں۔ مثلاً ان کی غزل، کلاسیکی غزل کا آئنہ بھی ہے اور ایک چراغ بھی ہے وہ کلاسیکی شعریات کی نمائندگی بھی کرتی ہے اور جدید شعریات کو روشن بھی کرتی ہے۔ دوسری سطح پر آئنے کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ ان کی غزل دنیا اور زمانے کی عکاسی (تنقید کی زبان کی سب سے بڑی کلیشائی اصطلاح) یا ترجمانی بھی کرتی ہے اور چراغ کے مانند دنیا و زمانے کو نئے مضامین کی روشنی بھی دیتی ہے۔ غلام حسین ساجد ہی کا یہ شعر اسی بات کو پیش کرتا ہے:

شب بھر اِسی نواح میں پھیلے گی روشنی
ہو گی مرے چراغ سے ترسیلِ ہست و بود

غلام حسین ساجد نے کئی اشعار میں چراغ و آئینہ کو اکٹھے استعمال کیا ہے۔ کہیں اپنے تیسرے محبوب لفظ 'خواب' کو آئنہ و چراغ کے ساتھ برتا ہے۔ان کی غزل میں خواب کا تعلق بہ یک وقت چراغ اور آئینے سے ہے۔ چراغ اور خواب دو عالموں کو پیش کرتے ہیں۔خواب عالمِ اوّلین ہے اور چراغ اِس عالم کی تجسیم ہے۔ دوسرے لفظوں میں چراغ، عالمِ اوّلین یعنی عالمِ خواب کا آئنہ ہے:

نظر کی حد پہ جو اِک نجمِ خواب ہے ساجد
وہی چراغ ہے اُس کا، وہی دیا میرا

☆

عالمِ خواب سے اِک عالمِ امکانی تک
کھینچ لائی مری مشکل مجھے آسانی تک

☆

چراغ و آئنہ حیران کیوں نہیں ہوں گے
کہ مَیں صباحتِ گل کی ادا نہیں سمجھا

☆

کُھلے گی ایک دن سب پر حقیقت آئنے کی
طلسمِ خواب سے سارا جہاں روشن رہے گا

ساجد صاحب کی شاعری میں اگر کوئی مابعد الطبیعیات اُبھرتی ہے تو انہی تین استعاروں کی مدد سے، یہ تینوں مل کر ایک طرح کا نظامِ مراتب قائم کرتے ہیں۔ پہلا مرتبہ خواب کا، دوسرا چراغ کا اور تیسرا آئنے کا ہے، یہ تینوں ایک دوسرے پر منحصر بھی ہیں اور اپنا اپنا خود مختار منطقہ بھی تشکیل دیتے ہیں۔خواب کا تعلق ذات کی اس گہری تہ سے ہے جہاں اشیا و انفاس کی اصلی و اساسی ہیئت موجود ہے۔خواب اساسی ہیئتوں کے کشف کا ذریعہ ہے۔ چراغ انہی ہیئتوں کو مجسم نور بناتا ہے اور آئنہ انہیں باہر کی دنیا میں منعکس کرتا ہے۔سادہ لفظوں میں یہ اندر کی روشنی سے باہر کو منور کرنے کا عمل ہے۔غلام حسین ساجد کا یہ شعر اِسی حقیقت کو بیان کرتا ہے:

کُھلے گی ایک دن سب پر حقیقت آئنے کی
طلسمِ خواب سے سارا جہاں روشن رہے گا

یہیں ہم غلام حسین ساجد کی غزل کی سماجی معنویت کو بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر چہ ان کی غزل سماجی صورتِ حال کی دستاویز بننے کی طرف مائل نظر نہیں آتی مگر وہ باندازِ دگر سماجی معنویت کی حامل ضرور ہے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان ہوا، ان کی شاعری اندر کی روشنی سے باہر کو منور کرنے میں یقین رکھتی محسوس ہوتی ہے اس لیے وہ خواب، چراغ اور آئنے سے متعلق جتنے مضامین پیش کرتے ہیں وہ سماجی معنویت کے حامل بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً خواب و چراغ و آئنہ کو اگر پاکستان کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کے پس منظر میں رکھ کر دیکھیں تو ان کی معنویت سامنے آ جائے گی۔ خوابوں کی سرزمین، اس کی تعمیر و ترقی کے خواب، خوابوں کے شکستہ ہونے کے واقعات، اس کو روشن بنانے میں شاعروں اور دانش وروں کی مساعی، ان مساعی کی ناکامیوں کی عکاسی وغیرہ۔ لیکن غلام حسین ساجد کی غزل ان سب باتوں کو کہیں بھی واشگاف انداز میں پیش نہیں کرتی۔ ان کی غزل استعارے کی حرمت کو برقرار رکھتی ہے یعنی جس بات کو خفی طور پر سرگوشی کے انداز میں کہنا ہے اسے چیخم دھاڑ کے ساتھ نہیں کہتی جب ہم ان کی غزل کی سرگوشی کو سنتے اور اپنے سماجی تناظر میں اس کی تعبیر کرتے ہیں تو معلوم پڑتا ہے کہ شاعر جس آئنے کی حقیقت کے کُھلنے اور طلسمِ خواب سے جہاں کے روشن رہنے کی بات کرتا ہے وہ اجتماعی قومی خواب ہے۔ جس کا آئنہ اس کی شاعری ہے۔ دوسرے لفظوں میں شاعری و آرٹ میں جو باتیں بہ ظاہر انتہائی نجی و شخصی نظر آتی ہیں وہ بھی سماجی معنویت کی حامل ہوتی ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ذات کی تنہائی کا تجربہ، شاعری کا موضوع ہو سکتا ہے مگر اس تجربے کی ترسیل و تفہیم اجتماعی سماجی تناظر ہی میں ہوتی ہے۔ حقیقی آرٹ زیادہ سے زیادہ انسانی ہستی کے اندر گہرائیوں میں اُٹھنے والے جوار بھاٹے کو گرفت میں لینے کی سعی کرتا ہے جب آرٹ وجود میں آ جاتا ہے ایک لسانی سماجی میڈیم میں ظاہر ہو جاتا ہے تو وہ خود بہ خود سماجی معنویت کا حامل ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آیا مذکورہ مابعد الطبیعیات، شاعر کے لیے زنداں بنتی ہے یا دنیا و ذات کو سمجھنے کا ایک لچک دار، ایک طرح کی لامرکزیت کا حامل نظام؟ نظری طور پر دیکھیں تو کوئی بھی مابعد

الطبیعیات ایک غیر متزلزل مرکز کے بغیر قائم نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی شاعر کے یہاں ایک غیر متزلزل مرکز یعنی ایک واضح، غیر مبہم، داخلی طور پر منضبط نظامِ فکر ہے (خواہ یہ نظامِ فکری غیر مذہبی نوعیت ہی کا کیوں نہ ہو) تو اس کی شاعری مابعد الطبیعیات نوعیت کی ہوگی وہ اپنے نظامِ فکر سے باہر دنیا سے لاتعلق ہوگی یا اس کی وہی تعبیر قبول کرے گی جس کی گنجائش اس نظامِ فکر میں ہوگی۔ حقیقی شاعری کے لیے یہ صورت زنداں کی ہوتی ہے۔ حقیقی شاعری خود اپنے بنے ہوئے جال میں قید ہو کر نہیں رہ جاتی اس کے روزن دریچے باہر کی دنیا کی طرف کُھلے رہتے ہیں۔ غلام حسین ساجد کی شاعری میں ایک مابعد الطبیعیاتی منطقہ ضرور وجود میں آتا محسوس ہوتا ہے نہ کسی دوسرے نظریاتی مکتب سے وابستہ ہیں۔ ان کے لیے شاعری کے فنی مسائل اہم ہو سکتے ہیں نظریاتی نہیں۔ ''ہست و بود'' کی غزلوں میں کہیں کہیں مذہبی رنگ ضرور پیدا ہوا ہے (ممکن ہے عمر کے بڑھنے سے اس کا کوئی تعلق ہو) تاہم اس کی حیثیت ثقافتی ہے اسے نظریئے یا عقیدے کی ناصحانہ شاعری نہیں کہا جا سکتا۔ اپنے بہترین تخلیقی لمحات میں غلام حسین ساجد شاعری و آرٹ کی اوّلین حیرت کا تجربہ کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ غالباً اسی لیے وہ لفظوں کو نئے نئے سیاق میں استعمال کر کے ان کے سگنی فائیڈ یعنی ان کے معنیاتی سلسلوں کو اُلٹتے پلٹتے رہتے ہیں۔ اُنہوں نے کئی غزلیں یکساں ردیفوں میں کہی ہیں۔ اگرچہ مجھے اس طرح کی غزلوں سے اُلجھن ہوتی ہے کہ یہ مہارت و علم و قدرتِ بیان کی نمائش محسوس ہوتی ہیں (ممکن ہے میں غلطی پر ہوں) تاہم ان سے یہ بات واضح ہے کہ وہ ایک ہی لفظ یا ترکیب کو معنیاتی سطح پر اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہے ہیں۔ نیند، رنگ، ہست و بود کی ردیف والی غزلوں میں ان الفاظ کے ممکنہ معانی کی چھان پھٹک کی گئی ہے، نئے نئے سیاق میں انہیں برت کر ان کے معنیاتی اطراف کو سامنے لانے کی سعی کی گئی ہے، لفظوں کو اِدھر اُدھر، دائیں بائیں، اوپر نیچے درمیان یعنی ہر سمت سے، رخ رخ بدل بدل کو دیکھا گیا ہے۔ لفظ کی اندر کی کائنات کا چپہ چپہ چھاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ اِس فنی ہنر مندی کی ایک معنویت یہ ہے کہ کسی لفظ سے وابستہ معنیاتی سلسلے یا اس کے اطراف ہمیشہ کے لیے متعین نہیں ہیں۔ شاعر چاہے تو معانی کی دنیا کو مسلسل گردش میں رکھ سکتا ہے۔ چوں کہ معانی گردش میں ہیں اس لیے وہ حتمی طور پر کسی ایک مرکز سے بندھے ہوئے نہیں ہیں چوں کہ حتمی طور پر کوئی معنی متعین نہیں ہے۔ اس لیے ایک معنی، ایک خیال، ایک

حالت کا تحکم و اجارہ قائم نہیں ہو پاتا۔ ہم شاعری سے جس نجات و آزادی کی توقع رکھتے ہیں وہ معنی و خیال کے سلسلوں کو پلٹتے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسری معنویت یہ ہے کہ شاعری معنی یابی معنی آفرینی کا عمل ہے یعنی چراغ و آئنہ بنانے کا نا مختتم عمل۔ غلام حسین ساجد اپنی محبوب لفظیات کے معنیاتی سلسلوں کو بھی گردش میں رکھتے ہیں۔ تاہم نشانِ خاطر رہے کہ چند لفظوں کو لامتناہی طور پر گردش میں نہیں رکھا جاسکتا۔ چناں چہ خواب، چراغ، آئنہ معنیاتی سطحوں پر گردش میں رہنے کے باوجود ایک دائرہ (اپنے نظامِ مراتب کے علاوہ) بہ ہر حال تشکیل دیتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ دائرہ ہے فصیل نہیں (غیر مبہم نظامِ فکر فصیل ہوا کرتا ہے) اس لیے معنیاتی گردش اس کے حدود میں ردّ و بدل کرتی رہتی ہے اور اِسی کے نتیجے میں متکلم کا تناظر اور مرکز کا مقام بھی بدلتا رہتا ہے یہ شعر غالباً اِسی حقیقت کا ترجمان ہے:

جس دائرے نے گھیر رکھی ہے یہ کائنات
اس سے حذر کروں تو کہاں سے حذر کروں

خواب و چراغ و آئنہ کے دائرے نے یہ کائنات گھیر رکھی ہے۔ شاعر نے اپنے استعاراتی نظام و نظم سے جو دائرہ تشکیل دیا ہے وہ ایک اپنے رنگ کی تفہیم سے اس کائنات کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اس کی تعظیم کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے سامنے کی کائنات (سماج، دنیا، آفاق) کو شاعری و آرٹ کے وژن نے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک نئی کائنات (آرٹ کے دائرے میں گھری کائنات) وجود میں آئی ہے جس سے حذر نہیں کیا جاسکتا۔ یہی رائے غلام حسین ساجد کی شاعری کے بارے میں دی جاسکتی ہے کہ کوئی صاحبِ نظر اس سے حذر نہیں کرسکتا۔

◆◆◆

نعت

(عرضِ حال بہ حضورِ سرورِ کائناتﷺ)

آنکھ بینائی سے، رُوح تنہائی سے، ڈر رہی ہے، رسولِ خُدا، اَلْمَدَد
کفر کی تیرگی پھر مرے خون میں بھر رہی ہے، رسولِ خُدا، اَلْمَدَد

روکتا ہوں مگر پاؤں رُکتے نہیں، ابرِ رحمت مرے سر پہ جُھکتے نہیں
کوئی صورت الگ کارواں سے مجھے کر رہی ہے، رسولِ خُدا، اَلْمَدَد

اپنے ورثے کی ہر شے گنواتا ہوں مَیں، یاد کرتا ہوں اور بھُول جاتا ہوں مَیں
ظلمتِ شب اُٹھا کر مجھے طاق پر دھر رہی ہے، رسولِ خُدا، اَلْمَدَد

خوف آنے لگا ہے پس و پیش سے، اپنے موجود کے ہر کم و بیش سے
خندہ زن ایک دنیا مری بے بسی پر رہی ہے، رسولِ خُدا، اَلْمَدَد

نہر جاری رہے لطف و احسان کی، کم نہ ہو روشنی میرے ایمان کی
میرے اندر کہیں کوئی شمعِ یقیں مَر رہی ہے، رسولِ خُدا، اَلْمَدَد

۱۴؍جنوری ۲۰۰۷ء، لاہور

○

جہاں میں ڈالتے رہتے ہیں ماسوا کی طرح
درخت چل نہیں سکتے مگر ہَوا کی طرح

بھٹک کر آئی تھی کچھ دیر کو اِدھر دُنیا
لپٹ گئی مرے دل سے کسی بَلا کی طرح

مرے حصار سے باہر بھی وہ نہیں رہتا
مرے قریب بھی آتا نہیں خدا کی طرح

بہت سے رنگ اُترتے ہیں میری آنکھوں میں
کسی کے دھیان میں اُلجھی ہُوئی صدا کی طرح

اُتر گیا مرے دل میں وہ بے دھڑک، لیکن
لبوں پر آ نہیں پایا ہے مُدّعا کی طرح

رَواں دَواں ہیں مرے آس پاس کی اَشیا
پڑا ہُوا ہُوں زمیں پر مَیں نقشِ پا کی طرح

سِمٹ سکوں گا نہ اپنے وُجود میں ساجد
پہن لیا ہے کسی نے مجھے قبا کی طرح

۱۷/۱۸ جنوری ۲۰۰۴ء، لاہور

○

اِک روز مَیں بھی بابِ سخن سے گُزر کروں
یعنی کتابِ دشت و چمن سے گُزر کروں

نسبت رہے بہ طرزِ دِگر کارِ عشق سے
گھر میں پڑا رہوں کبھی بَن سے گُزر کروں

اُس خوش نظر چراغ کی آنکھوں میں دیکھ کر
اِس کارزارِ رَنج و محَن سے گُزر کروں

بے اختیار آتی ہے اِک گلبدن کی یاد
جب بھی دیارِ سرو و سمن سے گُزر کروں

پَر کھولتا ہُوں روز نئے ولولے کے ساتھ
دَھرتی پہ آ پڑوں کہ گگن سے گُزر کروں

اِک ماہ رُو کے واسطے رُک جاؤں کوئی دیر
اِس بار جب بھی مُلکِ یمن سے گُزر کروں

ساجدؔ غبارِ قریۂ جاں رہ چکا ہُوں مَیں
اب موجِ دردبن کے بدن سے گُزر کروں

۶ ر مارچ ۲۰۰۴ء، لاہور

○

دل و جاں کس ارادے سے بہم ہونے لگے ہیں
کہ دشمن بڑھ رہے ہیں، دوست کم ہونے لگے ہیں

حصارِ رَنج سے آزاد ہونے کو ہیں آنکھیں
مگر اب آئنے وقفِ اَلم ہونے لگے ہیں

یقیں اُٹھنے لگا ہے کاروبارِ عشق سے کیا
بہت دن بعد پھر قول و قسم ہونے لگے ہیں

دِکھائی دے رہا ہے ظلم کو انجام اپنا
کہ سر اُٹھنے سے پہلے ہی قلم ہونے لگے ہیں

درختوں پر فقط ہیں ڈھیر اب ٹوٹے پَروں کے
پرندے کون سی دُنیا میں ضم ہونے لگے ہیں؟

قریب آنے لگی ہے منزلِ مقصود شاید
ستارے پھر ہمارے ہم قدم ہونے لگے ہیں

انوکھے ڈھنگ سے آئی ہے اُس کی یاد ساجدؔ
کہ آنکھیں خشک ہیں اور ہونٹ نم ہونے لگے ہیں

۱۰/اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

شگفتِ آب سے مٹی کو آئنہ کرتے
چراغ سرد نہ ہوتے تو زمزمہ کرتے

بہت سے رنگ بھی رکھتے ہیں طاقتِ پرواز
ہوا میں صرف پرندے نہیں اُڑا کرتے

اثر نہ لیجیے اس گرم و سرد کا دل پر
کہ شور و شر سے پریشاں نہیں ہُوا کرتے

بندھے ہُوئے تھے مرے ہاتھ بھی تمھاری طرح
وفا سرشت میں ہوتی تو ہم وفا کرتے

زمین اوڑھ کے سوئے ہیں صاحبانِ عشق
اب اِس گلی کے دریچے نہیں کُھلا کرتے

عجیب پیاس تھی اُس دِل رُبا کی آنکھوں میں
ہم اُن کو چوم نہ لیتے تو اور کیا کرتے

بہت کشادہ تھی یہ ارضِ پاک اُن پر بھی
اگر وہ گھر سے نکلنے کا حوصلہ کرتے

جگہ نہ دیتے کسی خوف کو کبھی دل میں
کسی سے عشق جو کرتے تو بَرملا کرتے

اگر خراب ہُوئے مہر و ماہ کے ہاتھوں
کسی چراغ کے حق میں تو کچھ دُعا کرتے!

خیال اُن کو نہ ہوتا اگر محبّت کا
کبھی وہ نیند میں چلتے نہ رَت جگا کرتے

بدل دیا ہے زمانے نے اُس کو بھی ساجدؔ
پھر ایک بار کبھی اُس سے رابطہ کرتے

○

کبھی چراغ، کبھی آئنہ بناتے ہُوئے!
اُسے نگاہ میں رکھتا ہوں مسکراتے ہُوئے

اُداس رہ نہیں سکتا کہ میری آنکھوں میں
بہت سے پھُول اُترتے ہیں کھِلکھِلاتے ہُوئے

پلک جھپکنے میں کیا کچھ بدل گیا ہے یہاں
مَیں کھُو نہ جاؤں اُسے راستا دِکھاتے ہُوئے

پھر آج نیند میں چلتے ہُوئے خیال آیا
ستارے سو بھی تو سکتے ہیں جھِلملاتے ہُوئے

ہر ایک پَل میں بہت حادثے گزرتے ہیں
زمین گھومتی رہتی ہے تھرتھراتے ہُوئے

جدا ہُوئے ہیں کتابِ جمال سے جو لفظ
اُتر رہے ہیں مرے دل میں جگمگاتے ہُوئے

ہَوائے دہر نے کتنا بدل دیا ہے مجھے
وہ ڈر رہے ہیں مرے خواب میں بھی آتے ہُوئے

کبھی اُلجھتا ہوں صحرا کی بے کراں چُپ سے
کبھی مَیں گھر کو پلٹتا ہوں گُنگناتے ہُوئے

ابھی خمار ہے اِک رَت جگے کا آنکھوں میں
مَیں سو نہ جاؤں اُسے نیند سے جگاتے ہُوئے

بہت دِنوں سے مجھے انتظار تھا جس کا
قریب آنے لگا ہے بدن چُراتے ہُوئے

ذرا سے اُس کے لبوں پر جو لب رکھے مَیں نے
سمٹ گیا مری باہوں میں کسمساتے ہُوئے!

عجیب نشہ ہے ساجدؔ کلامِ موزوں میں
مَیں اُس کو بُھول نہ جاؤں غزل سُناتے ہُوئے

۱۱راپریل۲۰۰۴ء، لاہور

○

رُجوع کرتے ہُوئے اپنے مُدّعا سے مَیں
ترے علاوہ بھی کچھ مانگ لُوں خدا سے مَیں

کوئی چراغ اگر ہو مرے تعاقب میں
تھکن سمیٹتا جاؤں نقوشِ پا سے مَیں

فقیر ہُوں، اِسی کوچے میں خاک چھانتا ہُوں
صدا لگا نہیں سکتا مگر حیا سے مَیں

رُکوں گا جا کے کسی خوب رُو کی چوکھٹ پر
گلی میں پھُول کھِلاتا ہُوا دُعا سے مَیں

کبھی کبھی یونہی اپنے سے پوچھ لیتا ہُوں
کِسی کے کھوج میں نکلا تھا کب سبا سے مَیں

مرے بغیر مکمّل نہیں ہے یہ دُنیا
کہ اِس قضیّے میں شامل ہُوں ابتدا سے مَیں

شگفت ہوتا ہُوا آئنہ ہے دل میرا
مرے خدا! ابھی محفوظ ہُوں رِیا سے مَیں

رَگوں میں برف بنی نیند کے پگھلنے پر
تمھیں پکارتے نکلوں گا نینوا سے مَیں

سُنا ہے راہ میں ہوتے ہیں سایہ دار شجر
کبھی مِلوں گا کسی درد آشنا سے مَیں

لگا رہوں گا یونہی وصل کی تگ و دَو میں
مَروں کہ زندہ رہوں آپ کی بَلا سے مَیں

گلاب کِھلنے لگے ہیں مری رَگ و پے میں
کہوں گا جا کے چمن میں کبھی صَبا سے مَیں

ہدف بناؤں کسی سُورما کو اب ساجدؔ
تمام عمر نہ لڑتا رہوں ہَوا سے مَیں

۱۲ را پریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

زَمزَمہ کرتی ہُوئی، نیند اُڑاتی ہُوئی نیند
تُو نے دیکھی ہے کبھی دُور سے آتی ہُوئی نیند

تیرتی رہتی ہے دن بھر مری شریانوں میں
خون کا رنگ لیے، آگ بجھاتی ہُوئی نیند

اب تھکا ہارا پلٹتا ہُوں بہت رات گئے
اپنی آنکھوں میں لیے کام پہ جاتی ہُوئی نیند

کھوئی رہتی ہے کسی مُلکِ فراموشی میں
کارِ وحشت کو مرے، طیش دِلاتی ہُوئی نیند

اُس کی بُجھتی ہُوئی آنکھوں کی خبر دے شاید
گُھپ اندھیرے میں کہیں شمع جلاتی ہُوئی نیند

اُس کی دیوار کے سایے میں دِکھائی دے گی
گھات میں بیٹھی ہُوئی خواب چُراتی ہُوئی نیند

لُطف بھاری ہے زر و سیم پر اُس کا ساجد
کیوں نہ اَن مول ہو یہ بھاؤ بتاتی ہُوئی نیند

۱۳؍اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

نمودِ صبح کی صورت ابھی نہیں کچھ بھی
کہ سات سال میں بدلا ہے کیا کہیں کچھ بھی

کُھلے گا راز نہ فطرت کی شادمانی کا
کہ رَنج اُٹھاتے نہیں شہر کے مکیں کچھ بھی

زباں مِلی تھی مرے ایک ایک ریشے کو
مگر مَیں کہہ نہ سکا روزِ اوّلیں کچھ بھی

مرے نصیب کا لکھا اگر نہ بدلے گا
مجھے قبول ہے اے میرے ہم نشیں! کچھ بھی

چراغ و آئنہ و خواب پر نہیں موقوف
مَیں بھول سکتا ہُوں اِس حال میں کہیں کچھ بھی

طلسمِ خانۂ افلاک سے پلٹتے ہُوئے
کسی کے واسطے لائی نہیں زمیں کچھ بھی

خود اپنے آپ سے رہتا ہُوں بے خبر ساجدؔ
بہت اُداس ہُوں لیکن سبب نہیں کچھ بھی

۱۳ر اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

حضورِ دوست بھی آیا نہیں قرار مجھے
بہت کیا مری وحشت نے شرمسار مجھے

اُتر رہی ہے سیاہی مری رگ و پے میں
کسی چراغ کا رہتا ہے انتظار مجھے

کسی کی پھول سی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد
نہیں رہا گلِ حیرت پہ اعتبار مجھے

بھٹک رہا ہوں مگر کھو نہیں سکا اب تک
ابھی بھلا نہیں پایا ہے کردگار مجھے

نگارخانۂ انوار میں اُترتے ہوئے
کیا ہے کون سی صورت نے پھر شکار مجھے

کمند ڈالنے نکلا ہُوں آسمانوں پر
مگر نہیں ہے زمیں پر بھی اختیار مجھے

گِلہ نہیں ہے مجھے اپنے دوستوں سے کچھ
کِیا ہے پنجۂ اعدا نے تار تار مجھے

نبھا رہا ہُوں مَیں کس شوق میں زمانے سے
اگر ادا ابھی کرنی ہے رسمِ دار مجھے

مری نحیف صداؤں پہ کان دھرتے ہُوئے
تُو میرے رنگ میں کھو کر کبھی پُکار مجھے

وہ ہَست و بود کی زنجیر توڑنے والا
کرے گا اپنے اسیروں میں کب شمار مجھے

نیام کر نہیں پاتا ہُوں تیغِ آسائش
سَتا رہی ہے کوئی شکل بار بار مجھے

بُلا رہی ہے مجھے آبِ آئنہ ساجدؔ
کہ اپنے آپ پہ آنے لگا ہے پیار مجھے

۱۶/ اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کبھی چراغ، کبھی راستا بدل کر دیکھ
بہت قریب ہے منزل، ذرا سا چل کر دیکھ

ترے حصار سے باہر نہیں زمان و مکاں
تُو میری طرح کسی آئنے میں ڈھل کر دیکھ

فقیر بن کے وہ آیا ہے تیری چوکھٹ پر
یہ کوئی اور نہیں ہے ذرا سنبھل کر دیکھ

نگار خانۂ گردوں کو راکھ کرتے ہُوئے
ذرا سی دیر کسی طاقچے میں جل کر دیکھ

زمین تنگ ہُوئی جا رہی ہے لوگوں پر
حدودِ قریۂ جاں سے کبھی نکل کر دیکھ

رواں دواں ہیں کسی سمت میں کہ ساکت ہیں
پھر ایک بار ستاروں کی آنکھ مَل کر دیکھ

عجیب لُطف ہے ترکِ نشاط میں ساجد
جو ہو سکے تو مری بات پر عمل کر دیکھ

۱۷ اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

دن کے پیکر میں کہیں رات میں ڈھلتے ہُوئے رنگ
جانے رُکتے ہیں کہاں نیند میں چلتے ہُوئے رنگ

آخری شمع بُجھاتے ہُوئے اپنے گھر کی
مَیں نے دیکھے تھے کسی طاق میں جلتے ہُوئے رنگ

اُس پری زاد کی آنکھوں میں دِکھائی دیں گے
ایک ہی پَل میں کئی رنگ بدلتے ہُوئے رنگ

سر اُٹھاتے ہیں مرے ڈوبتے لہجے میں کہیں
گفتگو کرتے ہُوئے ، لفظ اُگلتے ہُوئے رنگ

صبحدم گھر سے نکلنا ہی اگر پڑ جائے
نیند سے آنکھ چُراتا ہُوں مَسلتے ہُوئے رنگ

ہار آیا ہُوں کسی آئنہ خانے میں اُنہیں
میرے ہمراہ نہیں آج اُچھلتے ہُوئے رنگ

اِک بدلتی ہُوئی دُنیا کے مکیں ہیں ساجدؔ
خاک پر گِرتے ہُوئے اور سنبھلتے ہُوئے رنگ

۱۸؍اپریل ۲۰۰۴ء ، لاہور

O

گھر سے حذر کروں کہ مکاں سے حذر کروں
اِس کاروبارِ سود و زیاں سے حذر کروں

بخشوں کسی فقیر کو اب تاج و تخت بھی
یعنی متاعِ نام و نشاں سے حذر کروں

توثیق کر چکا ہوں مَیں اپنے یقین کی
اب کارزارِ وہم و گماں سے حذر کروں

آ جاؤں اتفاق سے گر اُس کے سامنے
چُپ ہو رہوں کہ زورِ بیاں سے حذر کروں

جس دائرے نے گھیر رکھی ہے یہ کائنات
اُس سے حذر کروں تو کہاں سے حذر کروں

آنے لگی ہے آنچ مرے سنگ و خشت سے
کچھ دن ہجومِ شیشہ گراں سے حذر کروں

ساجد بدن نڈھال ہے، سر گھومتا ہُوا
کچھ روز سیرِ آبِ رَواں سے حذر کروں

۱۹/اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

گھر سے نکل کے صحنِ چمن میں نہ رہ سکے
کیا شہر میں رہیں گے جو بن میں نہ رہ سکے

گھٹنے لگا تھا میری رفاقت میں اُن کا دم
وہ روح بن کے میرے بدن میں نہ رہ سکے

خوشبو وہی ہے، رنگ وہی، ذائقہ وہی
لاہور آ بسے جو عدن میں نہ رہ سکے

صیقل رہیں گے آبِ بشارت سے دیر تک
وہ آئنے جو مُلکِ یمن میں نہ رہ سکے

زنجیر کر رہے تھے مجھے جن کے مرگ نین
وہ میرے بعد دشتِ ختن میں نہ رہ سکے

کیا لوگ تھے جو دل سے اُترتے چلے گئے
کیا رنگ تھے جو شہرِ سخن میں نہ رہ سکے

ساجدؔ اُنہیں تو گھر کو پلٹنا ہی تھا، مگر
ہم بھی دیارِ سرو و سمن میں نہ رہ سکے

۲۲ر اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

وحشتِ دل، غم و آلام کو رُخصت کر کے
آج آزاد ہُوں، خدّام کو رُخصت کر کے

نت نیا روپ بدل پائیں گے کیسے ہم تم
صورتِ گردشِ ایّام کو رُخصت کر کے

اُس کے کوچے سے نکلنا ہی اگر پڑ جائے
لَوٹ آئیں کسی ہم نام کو رُخصت کر کے

دن نکلنے میں بہت دیر نہیں ہو سکتی
رات آئی ہے اگر شام کو رُخصت کر کے

عرش کا نام اُسے دے لیں کہ صحرا کہہ لیں
چھت کھڑی کی ہے در و بام کو رُخصت کر کے

مجھ کو بہلا نہیں پائیں گے بدلتے موسم
غم زدہ ہُوں کسی گلفام کو رُخصت کر کے

کام کرنے سے مِلا کرتی ہے منزل ساجدؔ
خُوش ہُوں میں راحت و آرام کو رُخصت کر کے

۲۳/اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

آج وہ اور بھی تاخیر سے آئے گا میاں
اور مری خوبیِ تقدیر سے آئے گا میاں

سبز ہونے کو ہے خرقہ مری تنہائی کا
رنگ اک جنبشِ تحریر سے آئے گا میاں

بند آنکھوں سے مری ٹوٹتی شریانوں تک
زخم چل کر کسی زنجیر سے آئے گا میاں

بانٹ دینا ہے کسی حفظِ مراتب کے بغیر
رزق جتنا مری جاگیر سے آئے گا میاں

جس کی تقدیر بنایا گیا دشتِ غربت
لوٹ کر وہ بڑی توقیر سے آئے گا میاں

کوئی ملتان میں ویسا ہے نہ لاہور میں ہے
وہ پری رو کہیں کشمیر سے آئے گا میاں

صرف کہنے سے بدلتی نہیں دُنیا ساجد
یہ اُجالا دمِ شمشیر سے آئے گا میاں

۲۳ ر اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

چَراغ باقی رہا نہ اب آئنہ رہے گا
مگر شگفتِ جمال کا سِلسِلہ رہے گا

ہزار چوکس رہیں گڑی تیرگی کے دَاعی
مرے تصوّر میں ایک رَوزن کُھلا رہے گا

یقین آیا ہے آج الواحِ سنگ پڑھ کر
کہ اِس نگر میں بس ایک نامِ خدا رہے گا

یہی رہے گا اگر مری بے کسی کا عالم
دُعائیں بچ پائیں گی نہ دستِ دُعا رہے گا

سیاہ پڑنے لگے گی شمعِ وِصال کی ضَو
کُھلا ہُوا رات بھر جو رنگِ حِنا رہے گا

مری طرح نیند آ نہیں پائے گی اُسے بھی
مَیں جانتا ہوں وہ صبح تک جاگتا رہے گا

کہاں مِٹانے سے مِٹ سکے گا وہ نقش دِل سے
غُبار سا آئنے پہ اِک عکس کا رہے گا

خیالِ رہتا ہے نیند میں اب اُسی پَری کا
جو پُھول اب شاخ پر کِھلے گا، کِھلا رہے گا

سفر ہو پاتال کا کہ سَیرِ فلک ہو ساجدؔ
جہاں رہوں گا، زمین سے رابطہ رہے گا

۲۴/اپریل۲۰۰۴ء، لاہور

○

زمیں کا رنگ وہی، آسماں کا رنگ وہی
وہی صباحتِ گُل ہے، بِنائے سنگ وہی

عَدَن کی یاد دِلاتے ہیں اُس گلی کے مکیں
شکوہِ حُسن وہی ہے، دَہانِ تنگ وہی

جو خواب بن نہیں پایا تھا میری آنکھوں کا
ٹھہر گیا ہے مرے آئنے پہ زنگ وہی

بَدن میں آگ لگاتے ہُوئے دُعا کے ہاتھ
لہو میں پھول کھِلاتی ہُوئی اُمنگ وہی

بَدلنے والا ہی خود کو بَدل نہیں پایا
وہی بہانے ہیں اُس کے، ہے عذرِ لنگ وہی

ہزار صُلح کا پرچم بُلند کر دیکھو
مگر زمیں پہ مُسلَّط رہے گی جنگ وہی

پرانی وضع سے آیا ہُوں تیرے کوچے میں
بَدن میں زور وہی، رُوح میں ترنگ وہی

کچھ ایسے ڈھنگ سے تبدیل ہو رہا ہے وہ
کہ رہ نہ جائے کِسی مرحلے پہ دَنگ وہی

وہی نگر، وہی گلیاں، وہی مکیں ساجدؔ
پڑی ہے پاؤں میں زنجیرِ نام و ننگ وہی

۲۴/اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کِسی وُجود میں جلتا ہُوا چَراغ ہُوں مَیں
سو اِس نگر کے اندھیرے پر ایک داغ ہُوں مَیں

تمام شہر میں پھیلی ہُوئی ہے نیند مری
فشارِ خواب سے چَھلکا ہُوا ایاغ ہُوں مَیں

مرے قریب جو آنے لگا ہے بے کھٹکے
اُسے یقین نہیں ہے کہ بد دماغ ہُوں مَیں

مجھے مِٹانے چلے ہیں جو نقشِ پا کی طرح
اُنہیں یہ عِلم نہیں آخری سُراغ ہُوں مَیں

رُکا ہُوا بھی ہُوں اور بھاگ بھی رہا ہُوں مَیں
نظامِ کار کہیں ساعتِ فراغ ہُوں مَیں

بَدل سکوں گا نہ اِس دَشت کی فضا ساجدؔ
کہ موجِ رنگِ بقا ہُوں نہ کوئی باغ ہُوں مَیں

۲۴ر اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

زَمین میری رہے گی نہ آئنہ میرا
کہ آزمانے چلا ہے مجھے خدا میرا

مرے طِلسم سے آزاد بھی نہیں لیکن
وہ پھول پہلی نظر میں ہُوا نہ تھا میرا

نعیمِ بصرہ و بغداد ہارنے کے بعد
مرا وجود بھی شاید نہیں رہا میرا

وہ میرے پاس رہے یا کہیں چلا جائے
رہے گا اُس کے خیالوں سے سِلسِلہ میرا

کِسی کے کھوج میں نِکلا تھا بے ارادہ مَیں
بَدن نڈھال تھا، سَر گھُومتا ہُوا میرا

نہیں ہے اب مجھے انجام کی کوئی پَروا
بڑھا دِیا ہے محبّت نے حَوصلہ میرا

ہُوا ہے قطعِ مُسافت کا سِلسِلہ جاری
مَیں رُک گیا تو بَدن ٹوٹنے لگا میرا

یقیں نہیں ہے مگر نقش ہے مرے دِل پر
کہ اِک پَری نے بنایا ہے زائچہ میرا

وہ بار بار پلٹتا ہے دُور جا جا کر
سو ٹُوٹ ٹُوٹ کے جُڑتا ہے رابطہ میرا

نظر کی حد پہ جو اِک نجمِ خواب ہے ساجدؔ
وہی چَراغ ہے اُس کا، وہی دِیا میرا

۲۵/اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

مَیں اُس پَری کا اگر مُدّعا نہیں سمجھا
سمجھ میں کیا نہیں آیا، مَیں کیا نہیں سمجھا

یہی بہت ہے کہ اِس بار بھی مَیں دُشمن کو
بُرا سمجھتے ہُوئے بھی بُرا نہیں سمجھا

وہ مانتا ہے مرے اِختلاف کے حق کو
اُسے بٹھایا ہے سَر پر، خدا نہیں سمجھا

چَراغ و آئنہ حیران کیوں نہیں ہوں گے
کہ مَیں صباحتِ گُل کی ادا نہیں سمجھا

کسی بکھرتے ہُوئے خواب کے تعاقب میں
نِکل پڑا ہُوں مگر رَاستا نہیں سمجھا

بہت سے رَنج سہے اپنی جان پر لیکن
ترے وُجود کو خود سے جُدا نہیں سمجھا

ہزار مَیں نے ہر اِک چیز کی وضاحت کی
مگر وہ شخص مرا مسئلہ نہیں سمجھا

اُسی نے آگ لگائی تھی میرے ہاتھوں کو
جِسے میں بھول سے برگِ حنا نہیں سمجھا

کسی کی اُڑتی ہُوئی نیند کی حقیقت کو
نگر میں کوئی بھی میرے سِوا نہیں سمجھا

کھڑا ہُوا تھا کہیں بامِ عرش پر ساجدؔ
مگر زمین کو تحتِ الثّریٰ نہیں سمجھا

۲۷ر اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

سَفر کرتے ہُوئے ہر گام پہ منزل بناتا ہُوں
کہ مَیں آغاز ہی میں صُورتِ حاصل بناتا ہُوں

غُنودہ ہو رہی ہوتی ہیں جب اُس شمع کی آنکھیں
چَراغِ بے خودی کو نیند سے غافِل بناتا ہوں

مَزے سے کھیلتا رہتا ہُوں مَیں ہر رنگ کی بازی
کبھی آساں، کبھی ہر چال کو مشکل بناتا ہُوں

بِگڑتی جا رہی ہے عالمِ امکان کی صورت!
وہیں گرداب پڑتا ہے، جہاں ساحل بناتا ہُوں

اگر بھُولے سے کھِنچ جاتے ہیں اپنے نقش کاغذ پر
مَیں اپنا دِل بناتا ہوں نہ اُس کا دِل بناتا ہُوں

نئے پیکر میں ڈھلتا ہے اُجالا میرے ہاتھوں سے
سِتارے گوندھتا ہُوں اور مہِ کامل بناتا ہُوں

ذرا سا پھَڑ پھَڑاتی ہیں چراغوں کی لَویں ساجدؔ!
دَمِ شمشیر سے جب بازوئے قاتل بناتا ہُوں

۲۸/اپریل۲۰۰۴ء، لاہور

○

نِگار خانۂ ارض و سما مِلا کہ نہیں
اگر مِلا تو کوئی دِل رُبا مِلا کہ نہیں

شِکستہ دِل کو ضرورت ہے کِھلکِھلانے کی
پیامِ گُل سے تجھے حَوصلہ مِلا کہ نہیں

سیاہ نیند میں جلتے ہُوئے چَراغوں کو
کِسی گلی میں کوئی جاگتا مِلا کہ نہیں

رُکے ہُوئے تو رُکے ہی رہیں گے تا دَمِ مرگ
جو چل پڑے تھے اُنہیں رَاستا مِلا کہ نہیں

کِسی کو پُھول کِھلاتے ہُوئے مرے گھر میں
کوئی دَمکتا ہُوا آئنہ ملا کہ نہیں

شگفتِ خواب سے بھیگی ہُوئی اُن آنکھوں میں
کوئی سِتارہ مرے کام کا مِلا کہ نہیں

غزل کو سب کے لیے آئنہ بناتے ہُوئے
کِسی پَری سے ترا قافیہ مِلا کہ نہیں

رُکا تھا اور کہاں کاروانِ راحتِ عشق
پھر اُس کے بعد وہ شیریں ادا مِلا کہ نہیں

سوال کرتے ہیں اکثر مرے عدُو ساجدؔ
کہ اِس نگر میں کوئی آشنا مِلا کہ نہیں

۳۰ر اپریل ۲۰۰۴ء، لاہور

○

دیارِ خواب کو نِکلوں گا سَر اُٹھا کر مَیں
کہ شاد رہتا ہُوں رَنجِ سَفر اُٹھا کر مَیں

چَراغ جَل نہ سکے گا جو اُس کی آنکھوں میں
دَھروں گا اُس کو کِسی طاق پر اُٹھا کر مَیں

سُنا ہے! تختِ مُقدَّر سے ہاتھ آتا ہے
خجل ہُوں راحتِ تیغ و سِپر اُٹھا کر مَیں

چلے جو سرو و سمن مَیں بھی ساتھ چل دُوں گا
کھڑا رہوں گا نہ بارِ ثمر اُٹھا کر مَیں

ترے بہشت میں دِل لگ نہیں رہا میرا
کہ ساتھ لا نہیں پایا ہُوں گھر اُٹھا کر مَیں

اُلجھ رہا ہو اگر غیر کی نگاہوں سے
لپیٹ لیتا ہُوں تارِ نظر اُٹھا کر مَیں

الگ نہیں ہُوں مَیں اپنی طرح کے لوگوں سے
پڑا ہُوں زحمتِ دیوار و در اُٹھا کر مَیں

نہیں سُنوں گا نصیحت کِسی سِیانے کی
رہوں گا تہمتِ نوعِ بشَر اُٹھا کر مَیں

یقین کیسے نہیں آئے گا اُنہیں مجھ پر
وفا میں فرد ہُوں خوف و خطر اُٹھا کر مَیں

کہیں وِصال کی صورت اگر دِکھائی دی
نِکل پڑوں گا نہ شمعِ سَحَر اُٹھا کر مَیں

کِسی پَری کے تصوّر میں چُوم لیتا ہُوں
کِسی گلاب کو بارِ دِگر اُٹھا کر مَیں

بہت ہیں چاہنے والے مرے جہاں بھر میں
گرفتہ دِل نہیں بارِ ہنر اُٹھا کر مَیں

مکان چھوڑ تو دُوں اُس حَسین کے کہنے پر
گلی میں لاؤں گا کیا کیا مگر اُٹھا کر مَیں

مجھے وہ طیش دِلاتے رہے اگر ساجد
تو گوندھ دُوں گا یہ سارا نگر اُٹھا کر مَیں

یکم مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

گرمیِ حُسن ہو، بے قراری نہ ہو
کِس طرح عشق میں قلب جاری نہ ہو

رقص کرتے رہیں کِھلکِھلاتے قدم
لُطف آئے مگر نیند طاری نہ ہو

خُوش رہیں آئنے سے کہ بے زار ہُوں
کوئی صورت ہمیں اُس سے پیاری نہ ہو

فَقر اور فِکر کا فرق باقی رہے
شرم آئے مگر شرمساری نہ ہو

کیا یہ ممکن نہیں! آخری سانس تک
آگ جلتی رہے برفباری نہ ہو

سَر اُٹھا کر چلیں شہرِ عشاق میں
اے خدا! ایسی حالت ہماری نہ ہو

اپنی قسمت پہ شاکر رہیں عمر بھر
ہم جئیں یا مریں، غم گُساری نہ ہو

کھیت رہنا مُقدّر ہے عشاق کا
کون ہے جس نے یہ جنگ ہاری نہ ہو

کام آئے نہ آئے کسی کے، مگر
عقل سے میرا دُشمن بھی عاری نہ ہو

جان لو! شہر مسمار ہونے کو ہے
جب کتابیں تو ہُوں، کوئی قاری نہ ہو

خاک میں خاک کا رنگ گُھلتا رہے
کوئی نوری نہ ہو، کوئی ناری نہ ہو

فخر ہوتا ہے اپنی اَساطیر پر
سبکِ ہندی اگر دِل پہ بھاری نہ ہو

آج بھی قرطبہ کو نِکلتے ہُوئے
کھردُرا ہو مگر سانس کھاری نہ ہو

بام پر جو دِکھائی نہیں دے رہا
وہ کہیں محوِ آئینہ داری نہ ہو

رات پھر جاگ کر کاٹنی ہے اگر
شغل کوئی ہو، اختر شُماری نہ ہو

چاہیے جس پَری کی توَجُّہ مجھے
اُس کی عادت ہی غفلت شِعاری نہ ہو

جاگ اُٹھتا ہُوں، جب نیند آنے لگے
بات کرتا ہُوں جب میری باری نہ ہو

لَوٹ آؤں اگر اِتفاقاً کبھی
کوئی پُرشش نہ ہو، روبکاری نہ ہو

چین پڑتا نہیں عشق میں، جب تلک
یہ بَلا اپنے سَر سے اُتاری نہ ہو

سامنے اُس کے ساجدؔ اگر جائیے
صرف فریاد ہو، آہ و زاری نہ ہو

۲ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

(نذرِ غالبؔ)

رات پھر صحرائے زنداں نقشِ بے دروازہ تھا
اور یہ میری اُچٹتی نیند کا خمیازہ تھا

دیکھ کر آنکھیں بھر آئی تھیں مگر چھلکی نہیں
کیا مجھے اُس گُل بدن کے صبر کا اندازہ تھا

جمع ہوتے جا رہے تھے مرکزِ حیرت پہ عکس
آئنہ میری نگاہِ شوق کا شِیرازہ تھا

جھلملا اُٹھی تھی کوئی شے نگینے کی طرح
دُھوپ تھی یا اُس کے چہرے پر فشارِ غازہ تھا

کیا اُلجھتا مَیں کسی کے زرد رُو آہنگ سے
داغ جب میری جبیں پر خود مرا آوازہ تھا

مَیں تو سمجھا تھا کہ ساجدؔ رزقِ صحرا ہو چکا
صبح دَم میرے تعاقب میں غبارِ تازہ تھا

۲ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

ٹھہرنے کو ہے بستی کے در و دیوار پر پانی
کہ اب پتھر میں ڈھلتی جا رہی ہے موجِ حیرانی

خیال آتا ہے شہرِ آرزو کو چھوڑ دینے کا
بہت دُشوار ہو جاتی ہے جب بھی کوئی آسانی

یقیں آیا کہ ارزاں ہے متاعِ لُطف دُنیا میں
نتیجہ ہے عدو کی قدر کرنے کا پشیمانی

مُسلسل بڑھ رہا ہُوں جادۂ اِسلام پر اب تک
مگر خُوش آئے گا کِس کو مرا طرزِ مُسلمانی

وہی صورت، وہی اَطوارِ نیک و بد، وہی لہجہ
وہ پَل بھر میں کہیں سے ڈھونڈ لایا ہے مرا ثانی

مرے شعروں میں بہتا ہے سمندر میرے وِرثے کا
کہ میں گلشن طرازِ رنگ سحبآں ہُوں نہ خاقانؔی

جُدائی کی کَسک مِٹ جائے گی ساجدؔ مرے دِل سے
اگر پہچان لے بڑھ کر مجھے وہ دلبرِ جانی

۲ رمئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

جب طِلسمِ قُفلِ اَبجد کُھل گیا
حاصلِ گفتارِ سرمد کُھل گیا

ٹُوٹ کر آئی ہے اُس گُل پر بہار
جِسم لَو دینے لگا، قَد کُھل گیا

صبح لائی ہے رِہائی کی نوید
آسماں کُھلتے ہی گنبد کُھل گیا

کارزارِ عشق میں آنے کے بعد
رنگِ میراثِ اَب و جَد کُھل گیا

خود بخود آیا ہے لَب پر اُس کا نام
رُوح پر عُنوانِ اَرشد کُھل گیا

ریگِ صحرا لے اُڑی بادِ شُمال
دَشت گُم ہوتے ہی مَعبد کُھل گیا

آ گئی ساجد زَباں پر دِل کی بات
آج آخر اُن کا مَقصد کُھل گیا

۳ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

آئنہ رَوشن ہے، دِل بے نُور ہے
اب یہی صورت اُنہیں منظور ہے

تازہ دَم ہے یہ جہانِ خیر و شَر
دیکھنے والا تھکن سے چُور ہے

اُٹھ نہیں پایا حجابِ جسم و جاں
پھر مرا دِل کِس لیے مَسرُور ہے

ترک کر بیٹھا ہُوں مَیں بُغض و نَفاق
اب رواداری مرا منشور ہے

منزلِ مقصود، فردوسِ برَیں
آپ کے کوچے سے کتنی دُور ہے!

دیکھ سکتا ہوں، سمجھ سکتا نہیں
یعنی وہ صُورت ابھی مَستور ہے

سُرخ پتّوں میں دَہکتے ہیں چَراغ
سبز شاخوں پر سنہری بُور ہے

کاروانِ فقر کے پیشِ نظر
کوئی عورت ہے نہ کوئی حُور ہے

ہجر سے جِس نے کشیدِ فرح کی
اب شرابِ وَصل سے مَخمور ہے

دشتِ حیرت کو نِکل پایا نہ تھا
تیرے دروازے پہ جو مہجور ہے

کُھل نہیں پاتا کہ دن کی اوٹ میں
ماہِ نخشب ہے کہ مہرِ طور ہے

بر سرِ پیکار ہیں ساجد سبھی
کیا یہی اِس شہر کا دَستور ہے؟

۳ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

(نذرِ غالبؔ)

غُبار اُڑتا ہے مجھ سے پیشتر بھی بیش و کم میرا
کہ پیچھے رہ گیا ہے ہار کر نقشِ قدم میرا

مناسب ہے اگر تصویرِ وحشت بن کے رہ جاؤں
نِکل جائے نہ اُس کے سامنے آتے ہی دَم میرا

بچھڑ جائیں تو شاید یہ طِلسمی نیند کُھل جائے
کہ صیدِ راحتِ خوابِ رفاقت ہے صَنم میرا

سِتم یہ ہے کہ اپنے آپ پر ہنسنا بھی ہے مجھ کو
نہیں رہ پائے گا اب صرف رونے سے بھرم میرا

سزا پاؤں کہ سب میں فرد ہونے کی جزا پاؤں
مگر سَر ہو نہ پائے گا سرِ دربار خم میرا

بھٹک کر آ نِکلتا ہُوں سُخن آباد کو جب بھی
تو بڑھتا ہے خود اپنی ہی روانی میں قلم میرا

گلیم اوڑھے ہُوئے بیٹھا ہُوں فرشِ خاک پر ساجدؔ
دَھرا ہے طاقِ نِسیاں پر کہیں جاہ و حَشم میرا

۴رمئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

ہمارے ساتھ خُدا ہو کہ ہم خُدا کے ساتھ
مگر رہے یہی وابستگی دُعا کے ساتھ

کشید کرتے ہُوئے راحتِ وجود و عدم
دیے کے ساتھ رہوں گا نہ میں ہَوا کے ساتھ

نئے گلاب کریں گے مُکالمہ کِس سے
نِکل پڑوں گا چمن سے اگر صبا کے ساتھ

چَھلک نہ جائے کہیں ساغرِ متاعِ ہوش
رَہوں گا آج کِسی دَرد آشنا کے ساتھ

فِشارِ ضبط سے رُکنے لگی ہے سانس مری
مُقابلہ ہے کِسی صَبر آزما کے ساتھ

پسند ہیں مجھے مُلتان کے در و دیوار
نگار خانۂ اصطخر و نینوا کے ساتھ

اُسی چَراغ سے نِسبت رَکھوں ابھی ساؔجد
کہ دِل لگاؤں کِسی اور دِل رُبا کے ساتھ

۶ مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کوئی گردِش میں ہے کیا، دَشت سے گھر تک اب بھی
خاک اُڑتی ہے مری حدِّ نظر تک اب بھی

لے گئی کھینچ کے شاید اُنہیں مٹّی کی مہک
اُڑ کے پہنچے نہیں کچھ پھُول شجر تک اب بھی

رِزق بن جائیں گے کچھ دیر میں تاریکی کا
محوِ پرواز ہیں جو شمس و قمر تک اب بھی

اپنی بنیاد پہ قائم ہیں مرے ہوش و حَواس
خون چڑھتا ہے مرے پاؤں سے سَر تک اب بھی

ذکر چھِڑ جائے گا محفل میں اگر اُس بُت کا
بات پہنچے گی مرے دستِ ہُنر تک اب بھی

جن کو پانے کی تمنّا ہے ازل سے مرے ساتھ
ہاتھ پہنچا نہیں اُن برگ و ثمر تک اب بھی

کُھل نہیں پایا مری روح پہ صحرا ساجدؔ
یعنی محدود ہُوں مَیں سیر و سَفر تک اب بھی

۸ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

حاصل کِسی سے نقدِ حمایت نہ کر سکا
مَیں اپنی سَلطنت پہ حکومت نہ کر سکا

ہر رنگ میں رقیبِ زرِ نام و ننگ ہُوں
اِک مَیں ہُوں جو کِسی سے محبّت نہ کر سکا

گُھلتا رہا ہے میری رَگوں میں بھی کوئی زہر
لیکن مَیں اِس دیار سے ہجرت نہ کر سکا

پڑتا نہیں کِسی کے بچھڑنے سے کوئی فَرق
مَیں اُس کو سچ بَتانے کی زحمت نہ کر سکا

آیا جو اُس کا ذکر تو مَیں گُنگ رہ گیا
اور آئنے سے اُس کی شکایت نہ کر سکا

باقی رَکھی ہے میرے لہو نے متاعِ ہوش
مَیں نے وفا تو کی تھی، نہایت نہ کر سکا

اب بھی شگفتِ نور سے ہے اُس کو ربطِ خاص
وہ جو مرے چَراغ کی عزّت نہ کر سکا

ہر چند اُس گلاب پہ تشبیب کُھل گئی
اِس پر بھی مَیں گریز کی ہمّت نہ کر سکا

ساؔجد قفَس کی تیلیوں کو توڑ کر بھی مَیں
اِک دَشتِ بے کنار میں وحشت نہ کر سکا

۸ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کڑی نِگاہ رَکھے گا وہ سیم تن مجھ پر
کہ مہرباں ہے کِسی پھُول کا بَدن مجھ پر

مَیں ایک کھوئی ہُوئی آگ کی تلاش میں تھا
شگفت ہونے لگے ہیں مگر چمن مجھ پر

کوئی پُکارتا رہتا ہے نینوا سے مجھے
فریفتہ ہے بہت راحتِ عدن مجھ پر

پھر ایک بار وہی دُھوپ اوڑھ کر نِکلوں
کرے گا چھاؤں اگر آج بھی گگن مجھ پر

فِراق و وَصل حقیقت میں ایک ہوں کہ نہ ہوں
کِسی کے عشق میں لازم ہے حُسنِ ظن مجھ پر

الگ الگ ہی رہیں گے دَمِ وِصال بھی ہم
مَیں اپنے مَن پہ فِدا ہُوں نہ میرا مَن مجھ پر

کِسی طِلسم سے رَوشن ہے میرا دِل ساجدؔ
دیارِ غیب سے اُترے گا کوئی فن مجھ پر

۹ رمئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

جب کوئی پھول مُسَخّر نہ ہو آسانی سے
کام لیتا ہوں وہاں نقدِ ثنا خوانی سے

رَوشنی دینے لگے تھے مری آنکھوں کے چَراغ
رات تکتا تھا سمندر مجھے حَیرانی سے

کر کے دیکھوں گا کِسی طرح لہو کی بارِش
آتشِ ہجر بجھے گی نہ اگر پانی سے

اُن کو پانے کی تمنا نہیں جاتی دِل سے
کیا مُنوّر ہیں سِتارے مری تابانی سے؟

کوئی مصروف ہے تزئین میں قصرِ دِل کی
چوب کاری سے کہیں آئنہ سامانی سے

خاک زادوں سے تعلُّق نہیں رَکھتے کچھ لوگ
میزبانی سے غرض اُن کو نہ مہمانی سے

مَیں اِسی خاک پہ بیٹھا ہُوں بڑے شوق کے ساتھ
کوئی نِسبت نہیں اب تک مجھے سُلطانی سے

بند ہو جائے اگر روزنَ امکانِ خیال
خواب کِھلتے ہیں مرے دِل میں فراوانی سے

میری صُورت سے جو بیزار ہیں اب بھی ساجدؔ
کب وہ خُوش ہُوں گے مرے طرزِ مُسلمانی سے

۹ رمئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

سَر پر کِسی غریب کے ناچار گر پڑے
ممکن ہے میرے صبر کی دیوار گر پڑے

کیا خُوب سُرخ رُو ہُوئے ہم کارِ عشق میں
دو چار کام آ گئے، دو چار گر پڑے

اِس بار جب اَجل سے مرا سامنا ہُوا
کشتی سے خواب، ہاتھ سے پتوار گر پڑے

رَوشن کوئی چَراغ نہیں نخلِ طُور پر
سجدے میں کِس کو دیکھ کے اشجار گر پڑے

کرتی ہے فرشِ خاک کو دیوارِ آئنہ
آنکھوں سے جب یہ دولتِ بیدار گر پڑے

اُس پار دیکھ کر مجھے اِک گلبَدن کے ساتھ
جتنے مرے گلاب تھے اِس پار گر پڑے

ساجدؔ اگر عزیز تھی اپنی انا اُنہیں
کیا سوچ کر گلی میں مرے یار گر پڑے؟

۹ رمئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

صَید ہُوں روزِ ازل سے عالمِ اسباب کا
اور وَا رکھتا ہُوں سینے میں دَرِیچہ خواب کا

سامنے آتے ہی اُس کے میری وَحشت جاگ اُٹھی
دھیان رہتا تھا مجھے یوں تو بہت آداب کا

کارزارِ عشق سے باہر نکل کر دیکھیے
ساری بستی میں اُجالا ہے اُسی کمیاب کا

عالمِ رُویا میں دیکھا تھا جِسے مَیں نے کبھی
عکس ہے اب میری آنکھوں میں اُسی محراب کا

آ گیا آخر کتابِ عشق کا انجام بھی
دُور تک بکھرا ہُوا منظر ہے پہلے باب کا

شام ہے اور سُرخ پیڑوں کے دَہکتے سایے ہیں
نیند میں بہتا ہُوا دَھارا ہے جُوئے آب کا

کِس لیے ساجد بناتا ہُوں گھروندے ریت کے
رُخ بدل سکتا ہے تھوڑی دیر میں سیلاب کا

۱۰ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کچھ روز سے مَیں بھی بہت آسودگی کے ساتھ ہُوں
اب کوئی میرے ساتھ ہے یا مَیں کِسی کے ساتھ ہُوں

پَیوست ہے میرے لہو میں ظاہر و باطن کی ضَو
آزُردگی کے ساتھ ہُوں، جب سے خُوشی کے ساتھ ہُوں

اِک بوجھ ہے اب میرے سینے پر مری موجودگی!
مَیں ساتھ ہُوں اپنے، مگر اِک بے رُخی کے ساتھ ہُوں

کیا سوچ کر مَیں نے قدم رَکھّا تھا دَشتِ نجد میں
کیوں غیب سے اُتری ہُوئی آوارگی کے ساتھ ہُوں

مَیں ساتھ ہُوں اُس کے بہر صُورت طلوعِ مہر تک
سنجیدگی کے ساتھ ہُوں یا دل لگی کے ساتھ ہُوں

کہتا نہیں، سُنتا نہیں، ہنستا نہیں، روتا نہیں
مَیں بھی ازل سے آج تک کیسے غَمی کے ساتھ ہُوں

اِک موج میں بڑھتا چلا جاتا ہُوں منزل کی طرف
یعنی فنا کی راہ پر مَیں بھی سبھی کے ساتھ ہُوں

کچھ خوف کھانے کی ضرورت ہے نہ لازم احتیاط
مَیں لشکری ہُوں آپ کا اور آپ ہی کے ساتھ ہُوں

مُدّت ہُوئی ہے خود فریبی کے زمانے کو لدے
اب جو مرا ہو کر رہے گا، مَیں اُسی کے ساتھ ہُوں

ساجدؔ ابھی تک قرض ہے مجھ پر مری پہچان کا
شامل کِسی کے رنگ میں اپنی کمی کے ساتھ ہُوں

۱۱ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کِسی کی ماننے والا نہیں مَیں
اُنہیں اب چھوڑنے والا نہیں مَیں

ڈَٹا رہتا ہُوں اپنے فیصلے پر
مُکَرّر سوچنے والا نہیں مَیں

نظر رَکھتا ہُوں منزل پر بہر طور
پلٹ کر دیکھنے ولا نہیں مَیں

بدل سکتے ہو جو مہرہ بدل لو
یہ بازی ہارنے والا نہیں مَیں

بُھلا دُوں گا اُسے شاید کِسی دِن
اگرچہ بھُولنے والا نہیں مَیں

رَہوں گا اور اِسی گھر میں رَہوں گا
کہ ڈر کر بھاگنے والا نہیں مَیں

صَدائیں دے رہے ہیں شہر والے
مگر اب لوٹنے والا نہیں مَیں

لگا لیتا ہوں خُوش ہو کر گلے سے
اَجل کو ٹالنے والا نہیں مَیں

اَچانک رُک گئے ہیں پاؤں میرے
مُسافت کاٹنے والا نہیں مَیں

بناتا ہی رَہوں گا کوئی صُورت
کہ فارغ بیٹھنے والا نہیں مَیں

وہ خوش ہو لے مری مَٹّی اُڑا کر
ہَوا کو روکنے والا نہیں مَیں!

دَمکتے ہیں مری آنکھوں میں، لیکن
سِتارے بانٹنے والا نہیں مَیں

خفا تو رہ لیا کرتا ہُوں، لیکن
بہت دِن رُوٹھنے والا نہیں مَیں

مری طاقت ہے میری ناتوانی
شَجر سے ٹُوٹنے والا نہیں مَیں!

رَہوں گا اور دَھڑلّے سے رَہوں گا
مُعافی مانگنے والا نہیں مَیں

نظر رَکھتا ہُوں اپنے آپ پر مَیں
کِسی کا چاہنے والا نہیں مَیں

سَہُولت سے رَہیں اور خُوش رَہیں وہ
گھروں کو توڑنے والا نہیں مَیں

مُقدّر کا دَھنی ہے میرا دشمن
کہ اُلٹا سوچنے والا نہیں مَیں

قناعت کر لِیا کرتا ہُوں کم پر
بہت کچھ کھوجنے والا نہیں مَیں

مری جاں! اب کِسی لالچ میں آ کر
یہ صحرا چھاننے والا نہیں مَیں

اُداسی اور مایوسی میں گھِر کر
لکیریں کھینچنے والا نہیں مَیں

نہ ہاروں گا مگر یہ جانتا ہُوں
کہ اُس سے جیتنے والا نہیں مَیں

بہر صُورت متاعِ آئنہ سے
سمندر ڈھالنے والا نہیں مَیں

اگر گُم ہو رَہے ہو تو یہ سُن لو
پلٹ کر ڈُھونڈنے والا نہیں مَیں

مزے سے سو رَہا ہُوں اپنے گھر میں
گلی میں گھومنے والا نہیں مَیں

کِسی کے جی میں جو آئے، وہ کر لے
کِسی کو آنکنے والا نہیں مَیں

اُنہیں رَکھتا ہُوں سینے سے لگا کر
کتابیں پھُونکنے والا نہیں مَیں

مجھے وہ گالیاں دینے لگے ہیں
اُنہیں اب مارنے والا نہیں مَیں

وَفاداری ہے شرطِ اُستواری
حکومت توڑنے والا نہیں مَیں

کبھی سو بھی لِیا کرتا ہُوں ساجدؔ
مُسلسل جاگنے والا نہیں مَیں

۱۲ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کبھی مکاں کی طرف ہے کبھی مکیں کی طرف
کِسی کا رُخ ہے ازل سے مری زمیں کی طرف

چراغِ لالہ ہے رَوشن نہ سُرخ رُوئے حِنا
فضائے صحنِ گلستاں ہے یاسمیں کی طرف

مرے بَدن نے بھی اِس فیصلے پہ صاد کِیا
کہ داغِ سجدہ رَہے گا فقط جبیں کی طرف

طیورِ خواب ہوں، آئینے ہوں، سِتارے ہوں
رَواں دَواں ہیں سبھی عرشِ نیلمیں کی طرف

ہُوا ہے کوئی اگر فیصلہ مرے حق میں
کبھی مَیں ہاں کی طرف تھا، کبھی نہیں کی طرف

بَدل نہ پاؤں گا مَیں آسماں بدلنے سے
مرا جُھکاؤ رَہے گا اُسی حَسیں کی طرف

دیارِ دِل کا اندھیرا اگر چَھٹا ساجدؔ
تو دَھیان جائے گا اُس شمعِ اوّلیں کی طرف

۱۴رمئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

نظر اُسی کی ہُوئی، آئنہ اُسی کا ہُوا
کہ حُسن و عشق کا ہر سِلسِلہ اُسی کا ہُوا

سکون مِل نہیں پائے گا اب مجھے گھر میں
کہ میرا صَبر، مرا حَوصلہ اُسی کا ہُوا

مجھے بس اِتنی خبر ہے کہ چَل رَہا ہُوں مَیں
سَفر اُسی کا ہُوا، فاصلہ اُسی کا ہُوا

اُلٹ پلٹ کے بڑے شوق سے پڑھیں گے ہم
نظامِ دہر اگر زَائچہ اُسی کا ہُوا

مگن رَہا وہ اندھیرے کے کھوج میں، لیکن
کِسی چَراغ سے پھِر رابطہ اُسی کا ہُوا

یَقیں ہے راحتِ فَردا سے ہاتھ دھونے کا
جو میری فکر بھی اِک وسوسہ اُسی کا ہُوا

مُحیط تھا جو مرے کاروبارِ وَحشت پر
سِمٹ کر آج وہ اِک زَاوِیہ اُسی کا ہُوا

دِیا ہے نام جِسے کارزارِ ہَستی کا
شکست و فتح بھی اِک مرحلہ اُسی کا ہُوا

اب اُس کو میری خُوشی کا خیال ہے ساؔجد
سو میرے غم سے بڑا سانحہ اُسی کا ہُوا

۱۴ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

زَمیں کے ہو بھی چکے، آسماں کے ہو بھی چکے
طیور وَسعتِ کون و مکاں کے ہو بھی چکے

خود اپنے آپ سے رَکھّے کوئی غَرض کب تک
وہ میری طرح کِسی کارواں کے ہو بھی چکے

یقیں نہیں تھا جنہیں کاروبارِ اُلفت پر
وہ لوگ آج کِسی بدگماں کے ہو بھی چکے

بس ایک تازہ جَھلک پر کِسی سِتارے کی
مرے چَراغ کِسی مہرباں کے ہو بھی چکے

پَلٹ کر آ نہ سکیں گے نجومِ رَخشندہ
وہ اب صباحتِ آبِ رَواں کے ہو بھی چکے

مرے طِلسم سے آزاد ہو نہ پائیں گے
اَسیر وہ مری طرزِ فُغاں کے ہو بھی چکے

فقیر آئے تھے شہرِ سَبا سے جو ساجدؔ
نگار خانۂ شہرِ بُتاں کے ہو بھی چکے

۱۴ر مئی ۲۰۰۴ء، لاہور

○

عالمِ خواب سے اِک عالمِ امکانی تک
کھینچ لائی مری مُشکل مجھے آسانی تک

رُوح کا بوجھ لیے پھرتا ہے گلیوں گلیوں
کوچۂ صبر سے اُس کوئے پشیمانی تک

دَشت میں خلق کِیا رنگِ سُخن سے گرداب
کون پہنچے گا مری فکر کی جولانی تک

سامنے آن کھڑا ہے وہی آئینہ بدن
اُڑ گئی چشمِ نِگوں سار سے حیرانی تک

شرم آئی تھی مجھے اپنے قد و قامت پر
ماں کے جب ہونٹ نہ پہنچے مری پیشانی تک

شاعری نامہ بَری جب سے بَنی ہے ساجد
مَنع ہے اُس کے علاقے میں غزل خوانی تک

یکم جون، ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کوئی احسان کیا جائے نہ عزّت دی جائے
بس مجھے نیند میں چلنے کی اجازت دی جائے

مہرباں ہونے لگے ہو تو مری دُنیا کو
آئنہ جس کا ثمر ہے وہی صُورت دی جائے

دیر تک چھت پہ دَمکتی ہُوئی آوازوں کو
کبھی منظر دِیا جائے، کبھی حیرت دی جائے

چوگنے نفع کا وعدہ تھا مرا جس جس سے
کس طرح اب اُنہیں بازار کی قیمت دی جائے

اُس نے لکھی ہے ازل سے جو مری قسمت میں
کیا یہ ممکن ہے، مجھے آج وہ نعمت دی جائے

بُزدلی حرفِ ملامت کی سزاوار نہ ہو
جو بہادر ہوں، اُنہیں دادِ شجاعت دی جائے

اب تو ہوتی ہے زرِ صبر سے وحشت ساجدؔ
کب تلک ظلم کے بدلے میں محبّت دی جائے

۹/ جون ۲۰۰۴ء، لاہور

O

زَمیں روشن رہے گی، آسماں رَوشن رہے گا
مری موجودگی سے یہ مکاں رَوشن رہے گا

مُیَسَّر آ گئی آسودگی جب اِس نگر کو
چِھتوں پر رنگ، صحنوں میں دُھواں رَوشن رہے گا

کُھلے گی ایک دن سب پر حقیقت آئنے کی
طِلسمِ خواب سے سارا جہاں رَوشن رہے گا

اُسے محفوظ رَکھنے کی نِکالوں کوئی صُورت
کہ میرے بعد یہ منظر کہاں رَوشن رہے گا!

کِسی دِل میں اُترنے کی اُسے تکلیف کیوں دیں
وہ سب آنکھوں میں بے نام ونشاں رَوشن رہے گا

مجھے کیا عِلم تھا میرے مُقدّر کا سِتارہ
جہاں تم پاؤں رَکھّو گے وہاں رَوشن رہے گا

ہمارے دَم سے ہے تابندگی اِس قافلے کی
نہ ہم ہوں گے، نہ میرِ کارواں رَوشن رہے گا

بُجھا سکتا نہیں ہے کوئی میرے آئنے کو
اندھیرے میں بھی یہ آبِ رواں رَوشن رہے گا

کِھلے گا نیند کے صحرا میں جو بھی پھُول ساجدؔ
وَرائے لذّتِ وہم و گُماں رَوشن رہے گا

۹ رنومبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

خود اپنے وَاہموں سے بَرسرِ پیکار ہُوں مَیں
اور اِس پر بھی کِسی کی جان کا آزار ہُوں مَیں

حقیقت کُھل گئی ہے میری آنکھوں پر عدُو کی
نہ بولوں گا اگرچہ وَاقفِ اَسرار ہُوں مَیں

شِفا کی آرزو رہتی نہیں گو میرے دِل کو
مگر سچ ہے کہ تیرے عشق میں بیمار ہُوں مَیں

بہر صُورت مَیں خود کو آزمانا چاہتا تھا
بہت خُوش ہُوں کہ اپنی راہ کی دیوار ہُوں مَیں

ہَنسوں بھی تو بھری رہتی ہیں یہ بے نُور آنکھیں
کوئی بَتلائے گا، کِس رَنج سے دوچار ہُوں مَیں

بہت خُوش ہُوں مَیں گھر کی چار دیواری میں، پھر بھی
کہیں باہر نِکلنے کے لیے تیّار ہُوں مَیں

جُھکا دیتا ہُوں سَر اپنا مَیں ہر چوکھٹ پہ ساؔجد
اور اِس پر زَعم بھی ہے، صاحبِ کردار ہُوں مَیں

۹ر نومبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

رِدائے راحتِ کون و مکان اوڑھ کے دیکھ
زمین اوڑھ کے دیکھ، آسمان اوڑھ کے دیکھ

طِلسم ٹُوٹ چکا، جب چَراغِ ظلمت کا
کبھی صباحتِ نام و نشان اوڑھ کے دیکھ

پڑا رہے گا کہاں تک تُو اپنے ترکش میں
خدنگِ جستہ اگر ہے، کمان اوڑھ کے دیکھ

قریب آ ہی گیا ہے اگر وہ ابرِ کرم
سَفر میں آج یہی سائبان اوڑھ کے دیکھ

ہَوائے شہرِ حقیقت میں سانس لیتے ہُوئے
نگارخانۂ وہم و گمان اوڑھ کے دیکھ

پھر ایک بار کِسی جنگ پر نِکلتے ہُوئے
فِضائے قریۂ اَمن و امان اوڑھ کے دیکھ

نیا لِباس پہننے کا وقت ہے ساجدؔ
شکوہ اوڑھ کے دیکھ، آن بان اوڑھ کے دیکھ

۱۱رنومبر۲۰۰۴ء، لاہور

○

ٹُوٹ کر حلقۂ زنجیر سے نِکلا ہو گا
چاند کچھ اور بھی تاخیر سے نِکلا ہو گا

رنگ ڈالی ہے مری رُوح کی چادر جس نے
رنگ یہ موجِ مزامیر سے نِکلا ہو گا

بَل پڑا ہو گا جو اُس شوخ کی پیشانی پر
وہ مری خوبیِ تقدیر سے نِکلا ہو گا

آرزو اُس کو نہیں مجھ پہ کرم ڈھانے کی
وہ گلی میں کِسی تدبیر سے نِکلا ہو گا

آ گیا ہو گا اُسے میرے اُجالے پہ یقیں
سایہ جب تک مری تنویر سے نِکلا ہو گا

خُوش ادا تیغ و سِپر ڈالتے جاتے ہوں گے
شہر میں وہ بڑی توقیر سے نِکلا ہو گا

ثبت ہے آج جو ساجدؔ مری بینائی پر
عکس اُس پھُول کی تصویر سے نِکلا ہو گا

۱۹ر نومبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

اُتر کر میرے دِل سے قریۂ حیرت میں نکلے گا
وہ جس صُورت میں آیا تھا، اُسی صُورت میں نکلے گا

اُجالے گا کبھی مہرِ دَرخشاں کی طرح دِن کو
کبھی وہ آئنہ بن کر شبِ ظلمت میں نکلے گا

بَدل سکتی نہیں موسم بَدلنے سے بہار اُس کی
کہ وہ عُجلت میں آیا تھا نہ اب عُجلت میں نکلے گا

اُسے نِسبت رہے گی دیر تک شہری غزالوں سے
وہ دَشتِ نجد کی جانب کبھی فرصت میں نِکلے گا

مرے ہونے سے بے کل ہی سہی آسودگی میری
مگر اِک صَبر کا پہلو مری وَحشت میں نکلے گا

زباں پر آ نہ پائے گا کبھی بھُولے سے نام اُس کا
یہ گوہر میرے سینے سے کہیں غُربت میں نِکلے گا

بہت اَرزاں رَہا مَیں دیر تک اِس دھیان میں ساجدؔ
مرے دُشمن کا حصّہ بھی مری قیمت میں نکلے گا

۲۱ر نومبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

عَجب سودا سمایا میرے سَر میں
سکوں مِلتا نہیں اب بحر و بَر میں

ہے کیا اُس گُل بَدن کی آمد آمد
عَنادِل جمع ہیں کیوں میرے گھر میں

مُقابل آ گئی ہے آسماں کے
زَمیں تقسیم ہو کر خُشک و تر میں

کہاں جا کر مُکمّل ہوں گے ہم تم
کمی باقی ہے کیا نوعِ بشر میں

وجودِ غیر کا احساس کیا ہو
ابھی تک مَیں ہُوں دستِ کوزہ گر میں

رَگوں میں دَوڑنے پھرنے سے بڑھ کر
لہو کا رنگ ہے کارِ ہنر میں

جو کچھ میری حِفاظت کے لیے تھا
مُجسّم ہو گیا میری سِپر میں

کِسی کو حسرتِ تعمیر کیا ہو
نہیں جب فرق کچھ دیوار و دَر میں

ہَوس کا رنگ اُڑتا جا رہا ہے
کشش کم پڑ گئی کیا سِیم و زر میں

سِتارے سو رہیں میری بلا سے
رَہوں گا صُبح ہونے تک سَفر میں

اُترتے ہی نہیں وہ میرے دل سے
عجب اَسرار ہے لعل و گہر میں

دِکھائی دے کہیں وہ پھول ساجدؔ
پرو لاؤں اُسے تارِ نظر میں

۲۱ر نومبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

کُھلی جب سے حقیقت آئنے کی
بہت گُم سُم ہے صُورت آئنے کی

مری بُنیاد میں رَکھّے گئے ہیں
فسُوں آنکھوں کا، حیرت آئنے کی

در و دیوار رَوشن ہو رہے ہیں
نہیں اُس کو ضرورت آئنے کی

چَراغِ شام کے حصّے میں آئی
بڑی مُشکل سے راحت آئنے کی

کہیں طوفانِ اَبر و باد آیا
کہیں ٹُوٹی قیامت آئنے کی

رہے پیشِ نظر جب ذات اپنی
سزا بنتی ہے نعمت آئنے کی

خیال آیا کسی اُجلے بدن کا
بڑھی جب جب صباحت آئنے کی

بہت مصروف ہو جانے سے پہلے
پہن لیتا ہوں فرصت آئنے کی

جمالِ خواب سے محروم ہو کر
اُسے رہتی ہے حسرت آئنے کی

ہمارے ساتھ چکراتا پھرا ہے
کریں کیوں کر نہ عزّت آئنے کی

حصارِ صبر سے باہر نکل کر
کبھی دیکھوں قناعت آئنے کی

سبھی جب صیدِ نظارہ ہیں ساجد
کروں کس سے شکایت آئنے کی

۲۱ر نومبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

زَمیں کا رنگ اُڑا، آسماں کا رنگ اُڑا
ذرا سی دیر میں سارے جہاں کا رنگ اُڑا

سیاہ نیند میں گُھلنے لگا جمالِ شب
فشارِ خواب سے کون و مکاں کا رنگ اُڑا

وجودِ عکس میں صُورت دِکھائی دی کِس کی
یہ کِس کو دیکھ کے آبِ رواں کا رنگ اُڑا

کِسی وَسیلے سے مجھ تک پہنچ ہی جائے گا
کبھی جو راحتِ آیندگاں کا رنگ اُڑا

دیارِ صُبح میں آیا ہُوں کِس اِرادے سے
مَیں کہہ چکا تو مرے میزباں کا رنگ اُڑا

سُنا ہے لُطف سے بڑھ کر اُسے ہنسی آئی
مرے طِلسم سے جب کارواں کا رنگ اُڑا

مَیں اُس چَراغ کی حِدّت نہ سہہ سکا ساجدؔ
فروغِ وَصل سے مجھ ناتواں کا رنگ اُڑا

۲۳ر نومبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

سَحَر ہوتے ہی آنگن میں، کبھی چھت پر چہکتی ہیں
اور اُس کے بعد یہ چڑیاں مرے اندر چہکتی ہیں

سَمجھ میں خاک آئے گا چلَن اِن آرزوؤں کا
کبھی لَب سی کے بیٹھی ہیں، کبھی کُھل کر چہکتی ہیں

جنھیں آزاد رہنے کی تمنّا ہو وہ زنجیریں
حِصارِ موسمِ گُل سے کہیں باہر چہکتی ہیں

کنارِ خوابِ غفلت میں پڑے ہیں پُھول لالے کے
مگر یہ بُلبُلیں اب بھی کہیں شب بھر چہکتی ہیں

ہزاروں خواہشیں ہیں جو مرے آواز دینے پر
برنگِ آئنہ اُڑ کر بچشمِ تَر چہکتی ہیں

کھنچی رہتی ہیں میری ذات سے جو صُورتیں ساجدؔ
اُتر کر اُس کی آنکھوں میں وہی اکثر چہکتی ہیں

۳؍دسمبر۲۰۰۴ء، لاہور

○

یہی چراغ، یہی آئنہ اُدھر بھی تھا!
اِسی طرح کا کوئی سِلسِلہ اُدھر بھی تھا

اُتر رہی تھی یہی شام اُس گلی میں بھی
بَٹا ہُوا یہی دورانیہ اُدھر بھی تھا

خَجل تھا اپنے تجاوز پہ وہ بھی میری طرح
کہ ناتمام کوئی مرحلہ اُدھر بھی تھا

دَھرا ہُوا تھا کوئی آئنہ ہمارے بیچ
جو اِس طرف تھا، وہی فاصلہ اُدھر بھی تھا

دَھڑک رہے تھے عجب ڈھنگ سے ہمارے دِل
طیور چُپ تھے مگر زَمزَمہ اُدھر بھی تھا

اُسے بھی تاب نہ تھی ہمکلام ہونے کی
جو میرے دِل میں تھا اِک وَسوَسہ، اُدھر بھی تھا

اُسی نے زیر کیے ہفت آسماں ساجدؔ
کُھلا کہ خاک سے کچھ رابطہ اُدھر بھی تھا

۵/دسمبر۲۰۰۴ء، لاہور

○

با پردہ زرِ خواب ہے، تعبیر بَرہنہ
اُڑنے سے ہُوئی رات کی تنویر بَرہنہ

آنکھوں سے گریزاں تھی جو اِک دولتِ بیدار
مٹّی سے اُگی صُورتِ شمشیر بَرہنہ

آئے گی کِسی فصلِ بہاراں کے جَلو میں
لِکّھی ہے مُقدّر میں جو زنجیر بَرہنہ

چلنے سے بڑھا اور بھی آزارِ مُسافت
عُجلت کے تعاقب میں ہے تاخیر بَرہنہ

آباد رہیں گی یونہی اُس شہر کی گلیاں
پھِرتے رہیں بَن میں ترے نخچیر بَرہنہ

سُلتے ہیں عزاخانۂ اصطخر میں ساجدؔ
رہتے ہیں اِشارات و اساطیر بَرہنہ

۱۶ر دسمبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

اِنتشارِ محشرِ آشفتگاں گُم ہو گیا
آنچ باقی رہ گئی ہے اور دُھواں گُم ہو گیا

لے لیا شاید جُنونِ عشق نے پھِر دِشتِ نجد
بے در و دیوار سا یہ گھر کہاں گُم ہو گیا

بڑھ رہا تھا میری بینائی سے بڑھ کر رنگِ شب
دُھند آنکھوں سے چھٹی جب تک، مکاں گُم ہو گیا

مِٹ رہے ہیں ایک اِک کر کے نقُوشِ پا مرے
خاک گُم ہونے کو ہے اور آسماں گُم ہو گیا

یاد آجاتی ہے اُس کی اور وہ آ پاتا نہیں
بے نشاں موجود ہے لیکن نشاں گُم ہو گیا

اب یقیں کی دُھوپ پڑتی ہے مرے چاروں طرف
کاروانِ لذّتِ وہم و گماں گُم ہو گیا

ذائقہ کھونے کو ہے کچھ دیر میں اِس رنگ کا
نام رہتا تھا جو اِک وردِ زباں، گُم ہو گیا

سلسلہ در سلسلہ مجھ سے تعلّق ہے اگر
یہ کہانی ختم ہو گی، مَیں جہاں گُم ہو گیا

گھر سے نکلے ہو بہت تاخیر سے ساجدؔ میاں
رَاستے کی بھیڑ میں جب کارواں گُم ہو گیا

۱۹ر دسمبر ۲۰۰۴ء، لاہور

○

دیے جلائے گئے، آئنے بنائے گئے
کوئی بتائے! یہاں کون لوگ آئے گئے

متاعِ دِرہم و دِینار پر نہیں مَوقوف
مَیں سو گیا تو مرے خواب تک چُرائے گئے

بہت سے لوگ سَتائے گئے ہیں دُنیا میں
مگر وہ مجھ سے زیادہ نہیں سَتائے گئے

چَراغ سرد ہُوئے دُھوپ کی تمازت سے
درخت نیند کے عالم میں تھرتھرائے گئے

پناہ مِل نہ سکے گی کِسی کو گھر میں بھی
طیور صبح سے پہلے اگر اُڑائے گئے

سَحَر کے وَقت ہُوا فیصلہ نِکلنے کا!
قدم بڑھانے سے پہلے دِیے بڑھائے گئے

کِسی کے عام سے چہرے کو بُھولنے کے لیے
ہزار رنگ کے سَپنے مجھے دِکھائے گئے

پھر ایک بار اُسی ڈھنگ سے بہار آئی
سَروں کی فصل کٹی، پُھول بھی اُگائے گئے

زَمین پاؤں پکڑتی ہے اُس علاقے کی
کہیں جو کھوئے گئے، اُس گلی میں پائے گئے

مجھے تھی جِن کی غُلامی کی آرزو ساجدؔ
اَسیر کر کے مرے سامنے وہ لائے گئے

۲۰ رمئی ۲۰۰۵ء، لاہور

○

دُھوپ سے چھاؤں کے بدلنے تک
خواب باقی تھا آنکھ مَلنے تک

ایسے دُشمن پہ وار کیا کرتا
گِر گیا جو مرے سنبھلنے تک

اُس کے رُخسار کے اُجالے میں
پڑھتا رہتا ہُوں رات ڈَھلنے تک

بوجھ بَنتا نہیں کسی پر مَیں
ساتھ چلتا ہُوں کام چلنے تک

کارِ دُنیا بھی خوب ہے، لیکن
بچ نہ پاؤں گا دِل بہلنے تک

اِن ہی گلیوں میں گھومنا ہے مجھے
سایۂ مہر و مَہ کے ٹَلنے تک

نیند آتی نہیں اُسے ساجدؔ
میرے گھر کا چَراغ جلنے تک

۲۰ر مئی ۲۰۰۵ء، لاہور

○

زَمیں بدلنے لگی، آسماں بدلنے لگا
کِسی طِلسم سے سارا جہاں بدلنے لگا

دِکھائی دینے لگی روشنی حقیقت کی
نگار خانۂ وہم و گماں بدلنے لگا

زَمین تنگ ہُوئی جا رہی ہے اب ہم پر
مکیں بدلنے سے پہلے مکاں بدلنے لگا

جب اُس نے جمع کِیا اپنے آپ کو مجھ میں
نصابِ قریۂ سود و زیاں بدلنے لگا

کِسی چَراغ نے اِک آئنے سے اپنا وُجود
کہاں بدلنا تھا لیکن کہاں بدلنے لگا

قریب آنے لگا ہے کوئی شگفتہ بَدن
ہَوا بدلنے لگی ہے، دُھواں بدلنے لگا

مرے حِصار سے نِکلا ہے کوئی پُھول کہ پھِر
کوئی سِتارہ کہیں کہکشاں بدلنے لگا

جہانِ خواب کی پہچان کھو نہ جائے کہیں
یہ سیلِ رنگ اگر ناگہاں بدلنے لگا

ہَوا میں گُھلنے لگی نیند اُس پَری وَش کی
جہانِ رفعتِ تیغ و سِناں بدلنے لگا

گلے کا ہار ہُوئی جا رہی ہے خاموشی
مَیں کیا کہوں کہ مرا ہم زباں بدلنے لگا

گرفتہ دِل تھے سِتارے مری رَفاقت میں
مَیں رُک گیا تو مرا کارواں بدلنے لگا

یَقین کیوں نہ اُٹھے عشق سے مرا ساجدؔ
عدُو بھی اُس کی طرح اب بیاں بدلنے لگا

۲ تا ۶ رجون ۲۰۰۵ء، لاہور

○

زَمیں بنائی گئی، آسماں بنایا گیا
مَیں چل پڑا تو مرا کارواں بنایا گیا

سِتارے مِل نہیں پائے تو میری آنکھوں سے
چَراغ خانۂ آشُفتگاں بنایا گیا

عطا ہُوئی تھی جو دولت مجھے وِراثت میں
اُسی سے لشکرِ سود و زِیاں بنایا گیا

مگن تھا اپنی رفاقت میں میرا دِل سو مجھے
شرر بنانے سے پہلے دُھواں بنایا گیا

اَسیر کر کے کِسی آئنے میں دِل میرا
سَفیرِ راحتِ آیندگاں بنایا گیا

کلام کرنے کی حاجت نہیں جسے مجھ سے
اُسے زَمیں پہ مرا ہم زباں بنایا گیا

مرے یقین کی مٹّی کو گوندھ کر ساجدؔ
وجودِ قریۂ وہم و گماں بنایا گیا

۸/جون ۲۰۰۵ء، لاہور

○

آنکھوں میں اُس کے خواب رہے اور نمی رہی
جس کی کمی کا خوف تھا، اُس کی کمی رہی

ہونٹوں سے چل کے آئی تھی مجھ تک جو نرم دُھوپ
آنکھوں کی راہ سے مرے دِل میں جمی رہی

ٹُوٹی نہیں ہے شِدّتِ گریہ سے میری نیند
گردِش میں آ کے بھی مری دُنیا تھمی رہی

جب تک رہا خیال اُسے سَیرِ باغ کا
اُڑتے رہے گُلاب، ہَوا شبنمی رہی

دورانِ گُفتگو میں ترا ذکر جب ہُوا
دِل رُک گئے تھے اور فِضا ماتمی رہی

ساجدؔ اَسیر جس نگہِ ناز کا تھا مَیں
اُس کی نظر بھی بزم میں مجھ پر جمی رہی

۲۸ر دسمبر ۲۰۰۵ء، لاہور

○

زَباں کُھلنے لگی ہے، آنکھ کو بہنا پڑے گا
بہر صُورت اب اُس سے حالِ دل کہنا پڑے گا

مُبادا آ مِلیں بِکھرے ہُوئے لشکر کِسی دِن
نواحِ کاشغر میں دیر تک رہنا پڑے گا

اِشارہ دے رہا ہے صحن میں رُکتا اَندھیرا
کِسی دِن اب قضا کا وار بھی سہنا پڑے گا

کوئی وُقعت ہُوا کرتی نہیں غربت زَدوں کی
جہاں رَکھّے گا کوئی، شوق سے رہنا پڑے گا

اگر نِکلے ہو دَشتِ نامرادی کے سَفر پر
جو دُکھ آئے گا حصّے میں، اُسے سہنا پڑے گا

وہ دِن نزدیک ہے ساجد کہ میرے حُکم پر بھی
پہاڑ اُڑنے لگیں گے، برف کو بہنا پڑے گا

۲۶ر مارچ ۲۰۰۶ء، لاہور

○

ہَوا چلنے لگی ہے، ابر بھی چھایا ہُوا ہے
کہ اِک مہماں دیارِ غیب سے آیا ہُوا ہے

نہیں پاتا ہُوں کوئی لُطف اپنی داستاں میں
یہ قصّہ بھی بہت سی بار دُہرایا ہُوا ہے

ترے ہونٹوں سے مَس ہو کر شفق پُھوٹے نہ پُھوٹے
تری آنکھوں نے سارا باغ دِہکایا ہُوا ہے

سکوں مِلتا نہیں ہے قلب کو قالب میں اپنے
وہ اِس گھر میں کہیں سے باندھ کر لایا ہُوا ہے

گُزر جاؤں گا اُس کے سامنے سے سَر جُھکائے
زَباں پر مہر ہے اور دِل کو سمجھایا ہُوا ہے

مَیں اپنے حافظے سے محو ہوتا جا رہا ہُوں
کِسی کی یاد نے کیسا غضب ڈھایا ہُوا ہے

مرے مُنہ سے مرے کُھل کھیلنے کی بات سُن کر
کوئی ہنسنے لگا ہے، کوئی شرمایا ہُوا ہے

اگر ہو چشم تو یہ دہر ہے آئینہ خانہ
جنابِ میرؔ نے کیا خوب فرمایا ہُوا ہے

بہت دِن سے مجھے معلوم ہے یہ راز ساجدؔ
مجھے اُس نے فقط باتوں سے بہلایا ہُوا ہے

۲۶ / مارچ ۲۰۰۶ء، لاہور

○

لہو سے نکہتِ پندار کھینچی جا رہی ہے
کہ میرے سامنے دیوار کھینچی جا رہی ہے

محبت میں رَوا ہے ظُلم اور سَختی کا سہنا
مُشقّت ہے تو پھر بے کار کھینچی جا رہی ہے

زِباں پر رات دِن رہنے لگا ہے نام اُس کا
بَدن سے لذّتِ انکار کھینچی جا رہی ہے

اُدھڑتا جا رہا ہے روح کا ایک ایک بَخیہ
رِدَائے راحتِ افکار کھینچی جا رہی ہے

کمی آنے لگی ہے وقت کے دورانیے میں
مری بڑھتی ہُوئی رَفتار کھینچی جا رہی ہے

حقیقت خواب ہوتی جا رہی ہے دَاستاں کی
حکایت از گُل و گلزار کھینچی جا رہی ہے

ضمانت تھا کبھی جو اَمن کی دُنیا میں ساجدؔ
اُسی کے نام پر تلوار کھینچی جا رہی ہے

۴راپریل ۲۰۰۶ء، لاہور

○

حِصارِ حلقۂ زنجیر سے نِکل آیا
عدُو بھی مُلکِ اَساطیر سے نِکل آیا

جو کام اُس سے ملاقات کا بہانہ بنے
وہ میری خوبیِ تقدیر سے نِکل آیا

اُتر رہا تھا کِسی آئنے میں بدرِ منیر
ہلال بُرشِ شمشیر سے نِکل آیا

مرا وجود مداوا نہ بن سکا جس کا
وہ رَنگ اب مری تصویر سے نِکل آیا

گُریز اُس نے کِیا ہے کِسی مُغنّی سے
کہ ریگ زارِ مزامیر سے نِکل آیا

کِسی چُراغ سے ہوگا نہ سامنا اُس کا
جو اِس طرف کبھی تاخیر سے نِکل آیا

زَباں پہ مُہر لگانے کی دیر تھی ساجدؔ
جو مَیں نہ تھا وہی تحریر سے نِکل آیا

۹ رجون ۲۰۰۶ء، لاہور

○

متاعِ دوش رہے گی نہ باغِ آیندہ
لِپٹ رہی ہے بساطِ چَراغِ آیندہ

بھٹکتا رہتا ہُوں دِن رات اُس کے کوچے میں
کہ اِس طرف سے مِلے گا سُراغِ آیندہ

پلٹ کے دیکھتے رہتے ہیں پھُول ماضی کے
مگر نہیں ہے کِسی کو دماغِ آیندہ

وہ اپنی کیف بھری ساعتوں میں ڈوب گیا
مرے نصیب میں لِکھ کر ایاغِ آیندہ

لُٹا رہا ہُوں بڑے شوق سے جوانی کو
کہ رِہ نہ پائے لِبادے پہ داغِ آیندہ

۱۰ر جون ۲۰۰۶ء، لاہور

○

سِتاروں سے مُلاقاتیں نہیں کیں
پرندوں سے ابھی باتیں نہیں کیں

بہت چاہا ہے اُس نامہرباں کو
مگر اَشکوں کی برساتیں نہیں کیں

دُعا مانگی تھی اُس کو دیکھنے کی
سَحَر دَم تک مناجاتیں نہیں کیں

ترے غم سے تعلّق ٹُوٹنے پر
کِسی غم کی مُداراتیں نہیں کیں

کچھ ایسی چُپ لگی تھی شہر بھر کو
کِسی نے بھی بہت باتیں نہیں کیں

خموشی اوڑھ لی مَیں نے مکاں کی
در و دیوار سے باتیں نہیں کیں

اَدھورے ہیں مرے مانند ساجدؔ
وہ دِن جِن کی ابھی راتیں نہیں کیں

۹ر ستمبر ۲۰۰۶ء، لاہور

○

رَونق ترے کوچے کی کبھی کم نہیں ہو گی
یہ بزمِ نِگاراں ہے جو بَرہم نہیں ہو گی

یکتا ہُوں تو یکتا ہی رَہوں گا مَیں ہمیشہ
وہ ذات مری ذات میں مُدغم نہیں ہو گی

رہتا ہے بہت اپنے جنوں پر مجھے قابو
دِل راکھ بھی ہو، آنکھ مگر نَم نہیں ہو گی

رَکھی ہے نہ رَکھوں گا کوئی دہر سے نِسبت
معلوم ہے دُنیا مری ہمدَم نہیں ہو گی

اِک آہ جو اُٹھتی ہے مرے خواب کدے سے
کیا سحرِ دُعا سے بھی مجسّم نہیں ہو گی

اُٹھتی نہیں اِک گاؤں کی جانب مری آنکھیں
کیا شہر میں رہنے کی ہَوس کم نہیں ہو گی

کب تک مجھے پہچان نہ ہو گی مری ساجدؔ
کب تک مری ہستی مری محرم نہیں ہو گی

۵/اکتوبر ۲۰۰۶ء، لاہور

O

پلٹ سکو جو کسی طرح گھر کو میری طرح
تو ساتھ ساتھ رکھو شور و شر کو میری طرح

اُسے بھی چھو نہ سکے گی ہوائے رنگِ طرب
جو وہ بھی تازہ رکھے زخمِ سر کو میری طرح

نکل سکے نہ کسی راستے پہ بے کھٹکے!
جو ڈھونڈتے تھے کسی ہمسفر کو میری طرح

نہ خاک اُڑائی ہے اُس نے، نہ آنکھ ہی نم کی
گنوا چکا ہے کہیں خشک و تر کو میری طرح

کہاں نصیب ہُوئی منزلِ مُراد اُسے
وہ ناپتا ہے ابھی بحر و بَر کو میری طرح

چَراغِ کوئے نِگاراں، زرِ جمالِ خواب
عطا ہُوئے ہیں کِسی بے بَصَر کو میری طرح

نِثار ہونے لگے ٹہنیوں پہ برگ و بار
کہ پیار آیا ہے خود پر شَجر کو میری طرح

اَسیرِ شمسِ جہاں تاب کو کِیا اُس نے
اَدائے صَبر سِکھا کر نظر کو میری طرح

مِلے گی ایک نئی زندگی تمھیں ساجدؔ
اگر نِکال سکو دِل سے ڈر کو میری طرح

۶/اکتوبر ۲۰۰۶ء، لاہور

O

بہار آئی مگر بال و پَر نہیں آئے
سب آ گئے ہیں مرے ہمسفر نہیں آئے

بھٹک رہا ہُوں ابھی تک گھنے اندھیرے میں
مرے چَراغ ابھی لَوٹ کر نہیں آئے

نِگاہِ شوق نے لاکھوں جتَن کیے، لیکن
وہ اِس نواح میں اب تک نظر نہیں آئے

لہو اُگلتی ہُوئی شام کے بُلاوے پر
طیور آئے ہیں لیکن شَجر نہیں آئے

یہ اور بات مرے نامُراد رہنے پر
بہت سے پیڑ تھے، جن پر ثمر نہیں آئے

اُسی ہَوائے ہزیمت میں سانس لیتا ہُوں
تم آ رہے ہو، سُنا تھا! مگر نہیں آئے

بَدل چکی ہے زمانے کی چال تک ساجدؔ
مگر وہ اب بھی مری راہ پر نہیں آئے

۱۵/اکتوبر ۲۰۰۶ء، لاہور

○

کوئی دیوار گِری ہے مرے اَندر شاید
ہو گا اب حال مرا اور بھی اَبتر شاید

تیرگی جھُونے لگی ہے دِلِ آزُردہ سے
دُھوپ آنے لگی سایے کے برابر شاید

خواب میں دیکھ رہا ہُوں تجھے آتے جاتے
نیند آئی تھی ترے دھیان سے چُھپ کر شاید

دِشت میں آ کے خیال آیا ہے اپنے گھر کا
اِس سے پہلے وہیں دیکھا تھا یہ منظر شاید

جس نے بے دخل کیا ہے مجھے اپنے دِل سے
وہ بھی خُوش رہ نہ سکے گی مجھے کھو کر شاید

اوڑھ رَکھّی تھی تری یاد کی چادر مَیں نے
مہرباں مجھ پہ نہیں تھا مرا بستر شاید

دِن نِکلتا ہے تو بڑھتی ہے سیاہی شب کی
شہر ہو آپ کے آنے سے منوّر شاید

کوئی خود سا بھی دِکھائی نہیں دیتا ساجدؔ
میرا ہمزاد مگر مجھ سے ہو بہتر شاید

۲۳/۲۴/مارچ ۲۰۰۷ء، لاہور

O

وقت یوں ہی گزرتا جائے گا
کوئی آیا ہے اور نہ آئے گا

ٹھان لی ہے اُسے بُھلانے کی
خُوش رَہوں گا نہ غم سِتائے گا

سَر پہ اپنے اُٹھا رہا ہُوں جِسے
وہ مجھے خاک میں مِلائے گا

آرزو ہے جِسے بُھلانے کی
یاد آتا ہے، یاد آئے گا

ذہن و دِل سے ہے کب غرض اُس کو
وہ مری رُوح میں سمائے گا

اَگلے وَقتوں کی دَاستاں مَت چھیڑ
تُو بھی اب کیا مجھے رُلائے گا!

کوزہ گر کا ہے کام کوزہ گری
ٹُوٹ جاؤں گا، پھر بنائے گا

دیر میں آئے گا وہ بدرِ جمال
اور مجھے دیر تک جگائے گا

گھر سے باہر نِکالنے والا
دِل سے کیسے نِکال پائے گا؟

سَر میں سودا سَما چکا جس کے
بارِ اُلفت وہی اُٹھائے گا

اپنی چُپ پر ہے اعتماد مجھے
ہار کر وہ مجھے بُلائے گا

میری تحقیر کے اِرادے سے
اپنی عزّت بھی اب گنوائے گا

خدمتِ خلق کا ہے شوق جسے
کیا وہ میرے بھی کام آئے گا

اُس سے دِل جوئی کی توقّع تھی
کیا خبر تھی وہ دِل دُکھائے گا

لاکھ وحشت سہی اُسے مجھ سے
اپنا وعدہ مگر نبھائے گا

مفت ہاتھ آ گیا ہُوں مَیں جِس کے
میری قیمت وہی بڑھائے گا

نام اُس کا زَباں پہ آتے ہی
ساتھ میرا بھی نام آئے گا

مُنتظر ہُوں کہ اب مرا دُشمن
مجھ کو سینے سے کب لگائے گا

چل پڑے ہیں تری تلاش میں لوگ
کوئی مجھ کو بھی ڈھونڈ لائے گا

میرے دُشمن سے دوستی کر کے
کیا تُو میرا بھی سَر جُھکائے گا

دِل میں دبکا پڑا ہے دِل کا درد
سانس لُوں گا تو پھڑپھڑائے گا

چھین لی ہے ہنسی زمانے نے
اب وہ مُشکل سے مُسکرائے گا

جب چلے گی ہَوائے شامِ مَلال
شجرِ زیست تھرتھرائے گا

میرے قصّے کو چھیڑ کر اب وہ
اپنا قصّہ مجھے سُنائے گا

گھر میں اِک مَیں بَچا ہُوں اب ساجدؔ
کون ہے جو مجھے چُرائے گا

۱۷ر مارچ ۲۰۰۷ء، لاہور

○

طِلسمِ خانۂ گردوں وہی، خُدا بھی وہی
مری دُعا بھی وہی، حرفِ مُدعا بھی وہی

بھٹک رہا ہُوں اُسی مُستقل مزاجی سے
مرا اَندھیرا وہی ہے مرا دِیا بھی وہی

قدم اُٹھاتا ہُوں لیکن قدم بڑھاتا نہیں
سَفر وہی ہے تو زنجیرِ پیش و پا بھی وہی

پلٹ رہی ہے جہاں سے ہَوائے شامِ مَلال
وہی نگر مری منزل ہے، رَاستا بھی وہی

قدم قدم پہ وہی بے کلی سلاسل کی
شگفتِ جشنِ بہاراں وہی، قضا بھی وہی

مجھے یقیں ہے کہ مَیں پی رہا ہُوں آبِ حیات
وہی شریر سی خُوشبو ہے، ذَائقہ بھی وہی

بدل گیا ہے وہ کِس وَاسطے مجھے ساجدؔ
فِضائے خواب وہی ہے ابھی، ہَوا بھی وہی

۲۰ر اپریل ۲۰۰۸ء، لاہور

○

حِصارِ جسم و جاں سے رُوح کو آزاد کرتے ہی
مَیں خود کو بُھول جاتا ہے، خُدا کو یاد کرتے ہی

بڑھا آتا ہے خوابوں کی رفاقت میں جو چپکے سے
پَلٹ جائے گا میری نیند کو برباد کرتے ہی

ہمیشہ دھیان رہتا ہے مجھے اُس کی بَھلائی کا
جو مجھ پر آزماتا ہے سِتم اِیجاد کرتے ہی

کبھی تکلیف ہوتی ہے اُسے خُوش دیکھ کر مجھ کو
کبھی اَفسردہ ہوتا ہُوں اُسے ناشاد کرتے ہی

مجھے تیغِ تجاوُز کی ضرورت ہی نہیں پڑتی
اگر انصاف مِل پاتا یہاں فریاد کرتے ہی

رِہائی مِل گئی ہے دوستوں کی قید سے ساجد
مجھے اپنے عَدُو کے مشورے پر صاد کرتے ہی

۲۰ رمئی ۲۰۰۸ء، لاہور

○

ماورائے سُراغ ہُوں مَیں بھی
کوئی رنگِ فراغ ہُوں مَیں بھی

فخر ہے اپنی کم نمائی پر
اپنے ہونے پہ داغ ہُوں مَیں بھی

گُفتگو کا اُسے سلیقہ نہیں
اور بہت بد دماغ ہُوں مَیں بھی

اپنے دُشمن کی سُرخروئی پر
کِس لیے باغ باغ ہُوں مَیں بھی

سبز ہے خاک میرے گریہ سے
راحتِ باغ و راغ ہُوں مَیں بھی

رات پڑتی نہیں جہاں ساجدؔ
اُس گلی کا چراغ ہُوں مَیں بھی

۲۰؍جون ۲۰۰۸ء، لاہور

○

یہی نیند ہے اور یہی خواب تھا
مَیں جِس کے لیے کب سے بے تاب تھا

سِتارے اُترتے رہے جھیل میں
کوئی چاند شاید تہِ آب تھا

کِسی کارواں سے بچھڑنا مرا
کتابِ رفاقت کا اِک باب تھا

ہمکتا تھا خُوباں سے بازارِ دِل
مگر جِس کو چاہا وہ نایاب تھا

مرا فقر تھا اِک سہارا مرا
نہ کچھ مال و دولت، نہ اسباب تھا

چٹکتی رہی رات بھر چاندنی
چمن آبِ حیرت سے سیراب تھا

کبھی نیند کا ہُن برستا رہا
کبھی لَوٹنے کو زرِ خواب تھا

جِسے پار کرنے کی ہمّت نہ کی
وہ دریا حقیقت میں پایاب تھا

ہَوا لے اُڑی سب محلّات کو
کہیں نقشِ گنبد نہ محراب تھا

نہ تھی کوئی پہچان ساؔجد مری
کہ مَیں شاملِ رنگِ احباب تھا

۲۳ر جولائی ۲۰۰۸ء، لاہور

○

دریا سے اُلجھ کر کبھی صحرا سے اُلجھ کر
دیکھوں گا مَیں اِس عالمِ رُویا سے اُلجھ کر

آئینے کو پانا ہے تو، آئینے میں جھانکو
دُنیا کی خبر پاؤ گے دُنیا سے اُلجھ کر

وہ خواب جو آساں نہ ہُوئے تھے مرے دِل پر
بے سُدھ ہیں مری چشمِ تماشا سے اُلجھ کر

اُڑتے ہُوئے اِک طائرِ خُوش رنگ کے پیچھے
بے لُطف ہُوئے بامِ ثریا سے اُلجھ کر

آئیں گے وہ آئیں گے مرے خواب میں لیکن
رہ جائیں گے اِک سیلِ تمنّا سے اُلجھ کر

اب چھوڑ کے جائیں تو کہاں جائیں کہ ساجدؔ
آئے تھے یہاں عالمِ بالا سے اُلجھ کر

۲۴ راگست ۲۰۰۸ء، لاہور

○

مٹّی سے الگ ہُوں، کہیں پانی سے الگ ہُوں
اِک لہر ہُوں اور اپنی رَوانی سے الگ ہُوں

رہتا ہے ہر اِک محفلِ عِشرت میں مرا ذِکر
قصّے سے الگ ہُوں نہ کہانی سے الگ ہُوں

مَیں بخت ہُوں اور بخت ہمیشہ نہیں رہتا
راجا سے الگ ہُوں کبھی رانی سے الگ ہُوں

آیا نہیں اُس شوخ کے ہونٹوں پہ ابھی تک
اِک لفظ ہُوں اور رنگِ معانی سے الگ ہُوں

چُپکے سے اُترتا ہُوں مَیں ہر شخص کے دِل میں
تاثیر ہُوں اور شعلہ بیانی سے الگ ہُوں

شامل ہُوں اَزل سے مَیں ہر اِک کھیل میں ساجدؔ
ہر چند مَیں اِس عالمِ فانی سے الگ ہُوں

۲۴ر ستمبر ۲۰۰۸ء، لاہور

○

بَیاں اُس بزم میں میری کہانی ہو رہی ہے
اَدائے خاص سے رنگیں بیانی ہو رہی ہے

مہک آتی ہے اِک سیلی ہُوئی آزُردگی کی
کوئی شے ہے جو اِس گھر میں پرانی ہو رہی ہے

نظر آتے نہیں اب شام کو اُڑتے پرندے
تو کیا اِس شہر سے نقلِ مکانی ہو رہی ہے؟

بُلاوا آ گیا ہے اب کِسے کوہِ ندا سے
مری اطراف میں کیوں نوحہ خوانی ہو رہی ہے؟

لبوں پر ہے کِسی شیریں دَہن کے ذِکر میرا
رَتجگاں کی شام ہے اور گُل فشانی ہو رہی ہے

گریزاں ہیں مری صحبت سے کتنے لفظ ساجدؔ
ثمر آور مگر فصلِ معانی ہو رہی ہے

۲۶ر ستمبر ۲۰۰۸ء، لاہور

O

زمیں دُور تک، آسماں دُور تک
چلے ساتھ وہم و گماں دُور تک

سَحر دَم گھروں کو پلٹتے ہُوئے
مِلے راہ میں کارواں دُور تک

اُٹھائے جو ہاتھ اُس نے بہرِ دُعا
اُبھرنے لگیں کشتیاں دُور تک

خبر دے رہی ہیں کِسی شہر کی
سُلگتی ہُوئیں وادیاں دُور تک

مَیں اِس خاکداں پر اکیلا نہیں
یہاں ہیں مرے مہرباں دُور تک

مِلا مجھ کو اِذنِ تکلُّم کہ جب
نہیں تھا کوئی ہم زباں دُور تک

جنھیں میری وحشت نے پیدا کیا
رہیں ساتھ وہ دُوریاں دُور تک

کِسی آئنے میں سمٹنے کو ہے
یہ پھیلی ہُوئی کہکشاں دُور تک

کِسی نیند کا رنگ گُھلتا رہا
کِسی خواب کے درمیاں دُور تک

بالآخر مِلا پھر وہ شہرِ صَدا
مگر خامشی تھی وہاں دُور تک

کبھی دَشت و دریا تھے ساجد جہاں
دِکھائی دیے اب مکاں دُور تک

۲؍اگست ۲۰۰۹ء، لاہور

○

قَدم جب سے اَعدا کے منزل میں ہیں
مرے ساتھ کے لوگ مُشکل میں ہیں

مُقدّر میں جن کے نہیں آسماں
ابھی وہ سِتارے مرے دِل میں ہیں

بہار آئی ہے، پھُول آئے نہیں
کہیں گم وہ شورِ عَنادِل میں ہیں؟

جنھیں شاعروں نے روایت کیا
وہی خوبیاں میرے قاتل میں ہیں

رہے رات دِن کیوں نہ وِردِ زَباں
عجب لذّتیں حرفِ باطل میں ہیں

غَرض جِن کو کارِ جہاں سے نہ تھی
کئی روز سے فکرِ حاصل میں ہیں

قَدم میرے قَدموں پہ رَکھتے تھے جو
وہی آج میرے مُقابل میں ہیں

مری ذات پر بھی نہ ظاہر ہُوئیں
جو آبادیاں شہرِ داخل میں ہیں

جنھیں میری آنکھیں ترستی رہیں
وہ رنگینیاں ماہِ کامل میں ہیں

۵/اگست ۲۰۰۹ء، لاہور

O

کمند ڈالنے نِکلا تھا مَیں سِتاروں پر
نہیں بھروسہ مگر آج اپنے قَدموں پر

ڈھکی ہُوئی تھی اُسی خُشک آسماں سے زمیں
کہیں ہَوا میں نمی تھی نہ اوس پُھولوں پر

یہ اور بات دِکھائی نہیں دِیا مجھ کو
کِسی نے ہاتھ تو رَکھّے تھے میری آنکھوں پر

ہَوا میں پھیلتی جاتی ہے شام کی خُوشبو
اُتر رہے ہیں پرندے کہیں دَرختوں پر

نِبھا رہے ہیں روایت وہ اپنے آبا کی
مرے خُدا کی عنایت ہے میرے بچّوں پر

بُلا رہی ہے بہت پیار سے مجھے دُنیا
کرے یقین مگر کون اُس کی باتوں پر

رَہوں شجر سے مَیں پیوستہ کِس لیے ساجدؔ
بہار آئے گی اب بھی نئے شگوفوں پر

۵ راگست ۲۰۰۹ء، لاہور

○

بہار آئے، گُلِ یاسمیں چلے جائیں
جہاں کہیں سے تھے آئے وہیں چلے جائیں

رَہیں گے صرف اِسی خاک کے رَہیں گے ہم
پلٹ کر آئیں کہیں سے، کہیں چلے جائیں

ہُوا ہے مسند آشفتگی سے پھر اِرشاد
مکان جم کے کھڑے ہوں، مکیں چلے جائیں

بُجھے چَراغ کچھ ایسے کہ جِس طرح مجھ سے
مِلے بغیر مرے ہم نشیں چلے جائیں

سَمجھ رہے ہیں جنھیں لوگ اِس زمیں کا بوجھ
اُنہی کے ساتھ نہ عرشِ مبیں چلے جائیں

قَدم قَدم پہ یہاں سَر سے کھیلنا ہو گا
جنھیں قیام کا یارا نہیں چلے جائیں

جو سہ سکیں نہ زمانے کی سختیاں ساجدؔ
وہ لوگ شوق سے زیرِ زمیں چلے جائیں

۲۷راگست ۲۰۰۹ء، لاہور

○

دیارِ خواب سے کچھ سِلسِلہ میرا نہیں ہے
سفر میرا ہے لیکن فاصلہ میرا نہیں ہے

سنبھالی جائے گی کیا مجھ سے میری شادمانی
کِسی بے مہر سے جب رابطہ میرا نہیں ہے

کہیں چہرہ بدلتے آئنوں کی بے رُخی پر
یقیں سا ہے مگر یہ وسوسہ میرا نہیں ہے

بڑھاتا ہُوں قدم جب کوچۂ جاناں کی جانب
وہ کہتے ہیں کہ یہ بھی راستہ میرا نہیں ہے

اُسے سطحِ زمیں پر لا نہیں پاؤں گا شاید
تہِ آبِ رواں جو آئنہ میرا نہیں ہے

اُسے کیا اعتماد اپنے روّیے پر ہو ساجدؔ
کہ میرے ساتھ بھی جب حوصلہ میرا نہیں ہے

۳ر مارچ ۲۰۱۰ء، لاہور

○

میانِ راحتِ فصلِ بہار نکلے گا
اسی طرح مرے دل کا غبار نکلے گا

یہ ریگ زار ہی ہے میرے قتل پر مامور
نہیں کہ خاک سے کوئی سوار نکلے گا

کریں گی خلق اُسے میری بے بصر آنکھیں
وہ آئنہ جو سرِ کوہسار نکلے گا

کروں گا اِس کے در و بام سے کنارہ مَیں
اگر یہ شہر بھی غفلت شعار نکلے گا

ذرا سی دیر میں پایاب ہو گا یہ دریا
اور اِس کی کوکھ سے اِک ریگ زار نکلے گا

ابھی تلاش میں اِک نرم خُو مسافر کے
ہزارہا شجرِ سایہ دار نکلے گا

مَیں بے نقاب کروں گا عدو کو جب ساجدؔ
وہ کوئی میرا ہی خدمت گزار نکلے گا

۳؍مارچ ۲۰۱۰ء، لاہور

○

کِسی طرح کِسی صورت سے باز آیا مَیں
لو آج کارِ محبت سے باز آیا مَیں

کِیا جو غور زمانے کی سُست گامی پر
تو کارِ عشق میں عجلت سے باز آیا مَیں

عطا ہو راحتِ موجود کا پتا مجھ کو
دیارِ مستی و حیرت سے باز آیا مَیں

بدن کو پھوڑ کے اور روح کو رَفو کر کے
متاعِ غیر کی صحبت سے باز آیا مَیں

نظر سے نقشِ ملامت بھی نوچ پھینکا تھا
نہیں کہ صرف شکایت سے باز آیا مَیں

مری طرف بھی کِسی آنکھ سے اشارہ ہُوا
کہ اپنے آپ عداوت سے باز آیا مَیں

مجھے بھی ترکِ رفاقت کا شوق تھا ساجدؔ
کہ اُس پری کی اِجازت سے باز آیا مَیں

۴ر مارچ ۲۰۱۰ء، لاہور

○

(ثروتؔ حسین کے لیے)

میانِ بصرہ و بغداد رہ کر کیا کروں گا مَیں
تمھی کہہ دو، تمھارے بعد رہ کر کیا کروں گا مَیں

یہ سوچا ہے کہ دشتِ نجد کی جانب نِکل جاؤں
کہ اِس موسم میں یوں آزاد رہ کر کیا کروں گا مَیں

ٹھکانہ چاہتا ہُوں آج مَیں بھی طاقِ نسیاں پر
کہ اِس گھر میں کِسی کو یاد رہ کر کیا کروں گا مَیں

یہی بہتر ہے اُس کے آستاں کی خاک بن جاؤں
کہ اب یُوں خانماں برباد رہ کر کیا کروں گا مَیں

ٹھہر جاؤں کِسی مِٹتی ہوئی دنیا کے سایے میں
رہینِ صورتِ ایجاد رہ کر کیا کروں گا مَیں

کوئی اپنا نظر آتا نہیں اب دُور تک ساجدؔ
مگر اِس بات پر ناشاد رہ کر کیا کروں گا مَیں

۴ر مارچ ۲۰۱۰ء، لاہور

○

منزل کی گرد ہو رہا ہے
آئینہ سرد ہو رہا ہے

ق

دل کی خبر نہیں ہے، لیکن
سینے میں درد ہو رہا ہے

یعنی یہ طائرِ وفا بھی
اُڑنے میں فرد ہو رہا ہے

صد حیف اب یہ ماہِ کامل
چُپکے سے زرد ہو رہا ہے

پلکوں کی چھاؤں میں بڑھا تھا
ہاتھوں میں سرد ہو رہا ہے

مَیں تو بہت دُکھی ہوں ساجدؔ
کیا تجھ کو بھی درد ہو رہا ہے

۴؍مارچ ۲۰۱۰ء، لاہور

○

کبھی جب اہتمامِ خاطرِ ناشاد کرتا ہُوں
مَیں اُس کو یاد آتا ہُوں نہ اُس کو یاد کرتا ہُوں

رُکاوٹ کوئی آتی ہے اگر میری رَوانی میں!
زمینیں رَوندتا ہُوں، بستیاں برباد کرتا ہُوں

کبھی وقفِ الم رہتا ہوں کیسی بے نیازی سے
کبھی دستِ طلب سے راحتیں ایجاد کرتا ہُوں

کبھی جب تنگ پڑ جاتی ہیں مجھ پر شہر کی گلیاں
تو صحرا میں شگفتِ بصرہ و بغداد کرتا ہُوں

ستارے ٹُوٹنے لگتے ہیں اکثر میری آنکھوں سے
تمھیں مَیں یاد جب بھی اے بُتِ شمشاد کرتا ہُوں

پلٹ آتے ہیں اپنے ہم صفیروں کی معیّت میں
پرندے جو کسی کے نام پر آزاد کرتا ہُوں

بھرم کُھل جائے گا ساجدؔ مرے فہم و فراست کا
حضورِ شاہ میں جا کر اگر فریاد کرتا ہُوں

۱۰ر مارچ ۲۰۱۰ء، لاہور

○

اِک حلقۂ زنجیرِ الم توڑ کے نِکلا
جب عالمِ وِحشت میں اُسے چھوڑ کے نِکلا

آیا تھا ذرا بال مرے شیشۂ دل میں
مَیں رَنجشِ رفاقت کو وہیں موڑ کے نِکلا

رہتی ہے اُسے فِکر فقط سود و زیاں کی
مَیں اپنے مقدّر سے کِسے جوڑ کے نِکلا

آیا جو ترے شہر سے صحرا کی طرف مَیں
آنکھیں ہی چڑھائی تھیں نہ سَر پھوڑ کے نِکلا

۱۰/مارچ ۲۰۱۰ء، لاہور

○

دیکھا جو مَیں نے پھاند کے دیوارِ ہست و بُود
پیشِ نظر تھے پھر وہی آثارِ ہست و بُود

ہر چند رخشِ عُمر کو مہمیز بھی کِیا
کم ہو سکی نہ بڑھ سکی رفتارِ ہست و بُود

جب رِزق ہو چکے ہیں مرے خاکداں کا آپ
اب وضع کیجیے کوئی معیارِ ہست و بُود

اِک عُمر سے ہُوں راحتِ فردا کا ہم قدم
اِس بار سَر پہ آ پڑا ادبارِ ہست و بُود

اُس نے کنارہ کر لیا تقویمِ ذات سے
لکھ کر مرے نصیب میں اثمارِ ہست و بُود

آزاد ہو نہ پاؤں گا مَیں اپنی قید سے
مَیں کر سکوں گا کیا کبھی انکارِ ہست و بُود

خُوش ہے نہ خُوش رہے گا یہاں کوئی مشتری
روزِ ازل سے تیز ہے بازارِ ہست و بُود

کل کو کِسی طرح مری دُنیا بدل بھی جائے
پھر بھی بدل نہ پائیں گے اطوارِ ہست و بُود

ساجدؔ کِسی سے کوئی شِکایت نہیں کہ اب
ہے ناخُدا کے ہاتھ میں پتوارِ ہست و بُود

۱۵ر مئی ۲۰۱۰ء، لاہور

○

ہو گی نہ مجھ فقیر سے تعبیرِ ہست و بُود
یعنی رَہوں گا آج بھی نخچیرِ ہست و بُود

کیا رُک سکے گا میری ہزیمت کا سِلسِلہ
کیا ٹُوٹ پائے گی کبھی زنجیرِ ہست و بُود

مَیں کھو گیا صباحتِ فردا کے کھوج میں
پائی مرے وجود نے تنویرِ ہست و بُود

کیوں کر مجھے پسند نہ آئے گی چاند رات
بڑھتی ہے اِس چراغ سے تنویرِ ہست و بُود

کوئی نہیں ہے نجمِ صداقت سے ماوَرا
ہر آدمی پہ فرض ہے توقیرِ ہست و بُود

کیا مِل سکیں گے صبحِ دَرخشاں سے میرے خواب
کیا کر سکوں گا مَیں کوئی تدبیرِ ہست و بُود

ساجدؔ کھڑا ہُوں شمعِ بصارت کے روبرو
رکھی ہے طاقِ خیر یہ شمشیرِ ہست و بُود

۱۵ر مئی ۲۰۱۰ء، لاہور

○

کم پڑ رہی ہے راحتِ امکانِ ہست و بُود
ظاہر ہُوا ہے غیب سے عنوانِ ہست و بُود

خود پر نِگاہ کی کبھی اُس پر نِگاہ کی
لِکھّا تھا ہر کتاب میں فرمانِ ہست و بُود

شاید اُسے بھی شوق ہے تعبیرِ ذات کا
کچھ دِن سے میرا خواب ہے مہمانِ ہست و بُود

مَیں بھی نِثار ہوں گا کِسی گُل عذار پر
آیا جو میری راہ میں بُستانِ ہست و بُود

آئیں ذرا سی دیر کو نِکلیں گے اُس طرف
کل سے بہت اُداس ہے لبنانِ ہست و بُود

لِکھّی ہیں ہر مقام پہ فردا کی راحتیں
پڑھیے ذرا سا غور سے دیوانِ ہست و بُود

ساجدؔ زمینِ شعر سنبھالی نہ جائے گی
کمزور پڑ گیا اگر ایمانِ ہست و بُود

۱۶ر مئی ۲۰۱۰ء، لاہور

○

پارینہ ہے صباحتِ انجیلِ ہست و بُود
اب ہو گی اِسمِ ذات سے تکمیلِ ہست و بُود

بے شک مجھے وجود سے کوئی غرض نہیں
لِکھّی ہے پھر بھی رُوح پہ تفصیلِ ہست و بُود

ہر چند کیمیا مری فردا نژاد ہے
مَیں کر رہا ہوں آج بھی تعمیلِ ہست و بُود

شب بھر اُسی نواح میں پھیلے گی روشنی
ہو گی مرے چراغ سے ترسیلِ ہست و بُود

تبدیل ہو سکا نہ مرے شہر کا مزاج
مَیں بھی وہی ہُوں اور وہی تمثیلِ ہست و بُود

سوؤں گا دیر سے کبھی جاگوں گا دیر سے
کم ہو گی جب بھی راحتِ تعجیلِ ہست و بُود

ساجدؔ کتابِ لذّتِ دیروز کھولیے
کرنے لگے ہیں آئنے ترتیلِ ہست و بُود

۱۶؍مئی ۲۰۱۰ء، لاہور

○

کیا کر سکیں گے خاطرِ تقدیمِ ہست و بُود
کیا ہو سکے گی آپ سے تنظیمِ ہست و بُود

مِٹ جائے گا لطافتِ دوراں کا نام بھی
گر اب بھی کی نہ جائے گی ترمیمِ ہست و بُود

کیا جمع ہو سکیں گی مرے گھر میں راحتیں
جب میرا کام صرف ہے تقسیمِ ہست و بُود

گر ہو سکے تو معبدِ اَسرار کھولیے
ہو گی نہ شرحِ خواب سے تفہیمِ ہست و بُود

جب تک جُڑا ہے صبحِ ارادت سے میرا نام
لازم ہے میری ذات پہ تعظیمِ ہست و بُود

ساغر اُچھالیے کبھی آنکھیں اُچھالیے
ہو گی اِسی خُمار میں تقویمِ ہست و بُود

کوئی دِکھائی دے گیا، کوئی نہیں دِکھا
طاری ہے میرے ذہن پہ تنویمِ ہست و بُود

شاید کہیں سُلوک کی منزل دِکھائی دے
بے کار اگر ہُوئی کہیں ترقیمِ ہست و بُود

ساجدؔ مَیں اُس چراغ کا احسان مند ہُوں
کرتی ہے جس کی روشنی تعمیمِ ہست و بُود

۱۶ر مئی ۲۰۱۰ء، لاہور

چلو مُلتان چلتے ہیں

(غلام حُسین ساجد کے لیے)

جہاں بوسیدہ گلیوں میں خنک پانی کی خوشبو ہے
جہاں اب دُھول اُڑنے کی کوئی صُورت نہیں ہے
کہ اُس مٹی کو اپنے آنسوؤں سے نَم کِیا ہے
ایک شاعر نے
جِسے اپنی وراثت سے محبّت ہے
جِسے مُڑ کر، پلٹ کر دیکھنے سے ڈر نہیں لگتا

چلو مُلتان چلتے ہیں
سُنہری نیند میں لپٹی ہُوئی تہذیب کے نقشِ قدم گِننے
مقابر میں دمکتے آئنوں کی آب سے مِلنے
گلی کُوچوں کی حیرت سے ردائے صبحِ نَو بُننے
طلسمی سرزمیں کی بے قراری سے اُلجھتے
ایک شاعر سے
''عناصر'' کی غزل سُننے

ثروت حسین

۱۵/نومبر ۱۹۸۶ء

Rang-e-Adab Publications

Office # 5 - Kitab Market, Urdu Bazar, Karachi.
0345-2610434 0336-2085325
021-32761100 0300-2054154
rangeadab@yahoo.com /rangeadab

ISBN: 978-969-7665-56-3

Rs: 500/-